فہرست مضامین

بابت ماہ ذی القعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ (مطابق دسمبر ۱۹۴۲ء و جنوری ۱۹۴۳ء) جلد ۲۱ عدد ۵، ۶

معذرت: شعبان کے پرچہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ تین مہینے (جمادی الاولیٰ، جمادی الآخرۃ اور رجب) کی اشاعتیں منسوخ کرکے آئندہ یہ رسالہ بروقت شائع ہوتا رہیگا لیکن افسوس ہے کہ اس کے بعد کاغذ کی نایابی اس حد تک پہنچ گئی کہ رمضان اور شوال کے پرچے تیار ہو کر پریس میں پڑے رہے اور بازار میں ایک رم کاغذ بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ پچھلے مہینوں میں کاغذ کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا تھا وہ جماعت کے لٹریچر کی طباعت میں صرف ہو گیا۔ اب ہم انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ اور ذخیرہ فراہم ہو جائے لیکن ابھی تک ہمیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ان حالات میں یہ پرچہ کب شائع ہوگا اور پھر ذی القعدہ کی اشاعت کب تک ہو سکے گی۔ جو اصحاب ہمارے کام سے ہمدردی رکھتے ہیں ان سے گذارش ہے کہ کاغذ مہیا کرنے میں ہماری مدد کریں۔ جب کاغذ مل سکتا تھا تو روپیہ نہ تھا۔ اب اللہ کے فضل سے روپیہ مہیا ہو گیا تو کاغذ ناپید ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ شیاطینِ جن و انس کا برپا کیا ہوا یہ فساد کب تک اللہ کے بندوں کو ان مشکلات و مصائب میں مبتلا رکھے گا۔

(باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی پریس۔ سرکلر روڈ میں طبع ہو کر دفتر "ترجمان القرآن" لاہور سے شائع ہوا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

شوال کے دوسرے ہفتہ میں حسب اعلان مجلس شوریٰ کا اجتماع دہلی میں ہوا تھا۔ رفقائے جماعت کو اس وقت سے روداد کی اشاعت کا انتظار ہے، مگر مجھے گوناگوں پریشانیوں نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ سکون کے ساتھ روداد مرتب کرتا۔ جو لوگ مجھ سے قریب تر ہیں اور حالات سے واقف ہیں انھیں رپورٹ نہ شائع ہونے پر شکایت نہیں ہے البتہ جو لوگ ۔ دور ہیں اور نہیں جانتے کہ میں اس وقت کن مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار ہوں اُن کے لیے یہ تاخیر بھی خاصی جائز وجہ شکایت ہے اور میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان سے معافی کی درخواست کروں۔

مجلس شوریٰ کے انعقاد کی اصلی غرض چند ایسے اختلافات کا حل تلاش کرنا تھا جو بدقسمتی سے ابتدائی مرحلہ ہی میں اس نازک موقع پر نظامِ جماعت کے اندر رونما ہو گئے تھے اور جن کی وجہ سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اقامت دین کی یہ منظم کوشش، جو ایک صدی کے تعطل کے بعد پھر مشکل شروع ہوئی ہے، شروع ہوتے ہی ختم نہ ہو جائے، اور ایسے مایوس کن اثرات اپنے پیچھے نہ چھوڑ جائے کہ اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی اس کی ناکامی مدتوں تک ایک مثال بن کر دینِ حق کے قیام کی سعی و جہد سے روکتی رہے۔ میں نے ان اختلافات کو سلجھانے کی جتنی کوششیں کیں اُن میں مجھے سخت ناکامی ہوئی، اور صرف ناکامی ہی نہیں ہوئی بلکہ تفرق و اختلاف اور بددلی اور بدگمانیوں کا زہر دور و نزدیک کے ارکان میں بالعموم پھیلنا شروع ہو گیا۔ تب میں نے مجبور ہو کر اصحاب شوریٰ کو دہلی میں جمع ہونے کی تکلیف دی تاکہ اس الجھن کو دور کرنے میں میری مدد کریں۔

چار پانچ روز ہم لوگ اس کام میں منہمک رہے۔ اولاً میں نے چاہا کہ اصل امور مختلف فیہ کو زیر بحث لایا جائے اور جو

لوگ مجھ سے یا میرے کام سے مطمئن نہیں ہیں وہ خفیہ پرچہ نویسی اور نجوی اور غیبت اور ارجاف کو چھوڑ کر جماعت کے سامنے اپنی بے اطمینانی کے اسباب صاف صاف بیان کردیں، پھر اگر جماعت اُن کے بیان سے مطمئن ہو جائے تو مجھے رہنمائی کے منصب سے معزول کردیا جائے۔ لیکن ان حضرات نے ایسا کرنے سے اجتناب کیا اس کے بعد میں نے جماعت کے سامنے تین متبادل صورتیں پیش کیں (ایک) یہ کہ میں خود استعفیٰ دیتا ہوں، میری جگہ کسی دوسرے شخص کو رہنما منتخب کرلیا جائے۔ (دوسرے) یہ کہ ایک شخص نہیں ملتا تو تین چار آدمی مل کر اس کام کو سنبھالیں (تیسرے) یہ کہ جماعت کا یہ نظام جو ہم نے بنایا ہے اُسے توڑ دیا جائے اور اُن سب لوگوں کو جو اس نصب العین کی خدمت کا عہد کر چکے ہیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس شخص کا جس پر اطمینان ہو اس سے وابستہ ہو کر کام کرے، اور جو لوگ کسی دوسرے سے مطمئن نہ ہوں مگر خود اپنے اوپر اطمینان رکھتے ہوں وہ خود اٹھیں اور کام کریں، اور جو لوگ دوسروں سے بھی مایوس ہوں اور اپنے آپ سے بھی وہ پھر "امام مہدی کے ظہور" کا انتظار کریں۔ پہلی تجویز اس بنا پر بالاتفاق رد کردی گئی کہ جو لوگ اس وقت تک جماعت میں شامل ہوئے ہیں اُن میں سے کوئی بھی اس بار کو سنبھال نہیں سکتا۔ خود اختلاف کرنے والے اصحاب بھی اس امر پر متفق تھے۔ دوسری تجویز بھی بالاتفاق رد کردی گئی کیونکہ نہ وہ شرعاً صحیح ہے اور نہ عملاً ہمارے مقصد کے لیے مفید۔ رہی تیسری تجویز تو اختلاف رکھنے والے اصحاب کی خواہش یہ تھی کہ اسی پر عمل کیا جائے اور میں خود بھی اسی طرف مائل تھا کیونکہ میں ایسے مختلف المزاج عناصر کے اجتماع میں کوئی خیر نہ دیکھتا تھا جو ترکیب و امتزاج قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اور اُن کم سے کم ضروری صفات سے بھی عاری ہوں جن کے بغیر کوئی کارگر جماعت نہیں بن سکتی لیکن اصحاب شوریٰ کی اکثریت نے اس تجویز سے سخت اختلاف کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اس طرح جماعت کو توڑ کر ہم اپنے نصب العین کی خدمت کرنے کے بجائے اس کے ساتھ دشمنی کریں گے اور ہماری یہ حرکت اُس جمود کے بقا و استمرار کے لیے ایک نئی وجہ بن جائے گی جو بالاکوٹ کی ٹریجڈی کے بعد سے ایک سو دس برس تک اسلامی تحریک پر طاری رہا ہے، اس لیے بجائے اس کے کہ چند اشخاص کے اختلاف کی وجہ سے جماعت ٹوٹے کیوں نہ وہ اشخاص جماعت سے ٹوٹ جائیں جو ساتھ مل کر نہیں چل سکتے۔ یہ دلیل اتنی وزنی تھی کہ آخر کار اسی کو غلبہ حاصل ہوا۔ جو حضرات اختلاف سے متاثر تھے ان میں سے بعض نے رجوع کرلیا اور صرف چار اصحاب ایسے رہ گئے جنھوں نے اختلاف پر قائم رہتے ہوئے جماعت سے

علیحدگی اختیار کرلی۔ ان اصحاب کے نام ظاہر کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہے مگر وہ خود اپنی علیحدگی کا اعلان پسند نہیں کرتے اس لیے بہتر ہے کہ ابھی اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دیا جائے، اگرچہ

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

لیکن ان حضرات کی علیحدگی کے بعد بھی میں جماعت کی قیادت کا بار سنبھالنا اس وقت تک جائز نہ سمجھتا تھا جب تک کہ رفقاء جماعت کو اختلاف کی پوری حقیقت سے آگاہ کرکے یہ دریافت نہ کرلیتا کہ آیا اس کے بعد بھی وہ مجھ پر اعتماد رکھتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ میں نے علیحدہ ہونے والوں کی وہ تحریر جس میں انھوں نے میری ذات پر اور میرے کام پر اپنے اعتراضات تفصیل کے ساتھ بیان کیے تھے جماعت کے سامنے پیش کردی اور ہر اعتراض کا جو جواب میرے پاس تھا وہ بھی بیان کردیا، پھر رفقاء سے عرض کیا کہ دونوں پہلوؤں کا بے لاگ موازنہ کرلیں اور آزادی کے ساتھ فیصلہ کریں کہ جس شخص کو انھوں نے ایک سال پہلے اپنا رہنما منتخب کیا تھا وہ اب بھی اُن کی نگاہ میں اس لائق ہے یا نہیں کہ وہ اس کو رہنما تسلیم کریں۔ جماعت کی طرف سے اس سوال کا جواب اثبات میں تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ تحریر جس کا تعلق تنہا میری ذات سے نہیں بلکہ دراصل جماعت اور تحریک سے ہے مجھ کو بصیغۂ راز دی گئی ہے اور ابھی تک اس کے مصنف اسے پرائیویٹ رکھنے ہی پر مصر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اسے اور اپنے جواب کو بلا تامل شائع کردیتا۔ الحمدللہ کہ میری زندگی میں کوئی راز نہیں ہے اور نہ میں پبلک زندگی اور پرائیویٹ زندگی کے فرق کا قائل ہوں خصوصاً جبکہ میں بندگانِ خدا کو ایک راستہ کی طرف دعوت دے رہا ہوں تو لوگوں پر میرا عیب و صواب سب کچھ کھل جانا چاہیے۔ میں نہ خود فریبِ نفس میں مبتلا ہوں، نہ خدا کو فریب دینا چاہتا ہوں، نہ خلقِ خدا کو۔ میں نے اس دین کے راستہ کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھ کر نہیں بلکہ خود اپنی ہی آنکھوں دیکھ کر اختیار کیا ہے اور معیارِ دینی کے لحاظ سے اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں۔ جو کچھ میں فی الواقع ہوں اس کے سوا کچھ اور اپنے آپ کو ظاہر کرنا میرے نزدیک حرام ہے۔ اگر کوئی مجھ کو میرے اصلی مقام سے بلند تر قرار دے تو مجھے اس کی غلط فہمی رفع کرنے میں بھی کوئی باک نہیں۔ اور اسی طرح اگر کوئی مجھ کو اس سے فروتر ٹھیرائے تو اس کی یہ رائے بھی مجھے متاثر نہیں کرسکتی۔ جتنی اور جیسی خدمتِ دین بجالانے کی اہلیت اور طاقت میں خود

اپنے اندر پاتا ہوں اسے بہر حال انجام دوں گا خواہ کسی کے نزدیک میں اس کا اہل ہوں یا نہ ہوں۔

مجھے معلوم ہے کہ ابھی جماعت میں کچھ اور لوگ ایسے موجود ہیں جو مجھ سے یا میرے طریق کار سے مطمئن نہیں ہیں اور وہ جگہ جگہ رفقائے جماعت میں بددلی پھیلاتے پھر رہے ہیں۔ میں ان حضرات سے عرض کروں گا کہ یہ ایک پاک جماعت ہے جو ایک پاکیزہ ترین مقصد کے لیے بنائی گئی ہے۔ براہِ کرم وہ اسے سیاسی جماعتوں کے سے ناپاک طریقوں سے گندہ نہ کریں۔ اُن کے لیے جائز اور معقول طریقہ یہ ہے کہ یا تو جماعت کے سامنے آکر دلیل و حجت سے میری نااہلی ثابت کریں اور مجھے رہنمائی کے منصب سے ہٹا دیں، یا پھر صبر کے ساتھ میری اطاعت کریں، یا اگر صبر بھی نہیں ہو سکتا تو جماعت سے نکل جائیں اور جو کچھ ان کو حق اور صواب نظر آتا ہے اس کے مطابق عمل کریں۔ یہ غیبت اور نجویٰ اور ارجاف جس میں وہ مبتلا ہو گئے ہیں، جماعتی اخلاق کے اعتبار سے بدترین جرائم ہیں جن کی سخت مذمت قرآن میں کی گئی ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی اس روش سے باز نہ آئے تو مجھے مجبوراً اُن کے خلاف سخت کارروائی کرنی پڑے گی۔ اب تک میں نے بہت سی فتنہ پردازیوں کو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا ہے لیکن اب میں کسی کے ساتھ رعایت کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوں۔ جماعتی نظام کے تحفظ کی ذمہ داری خدا اور خلق دونوں کے سامنے مجھ پر عائد ہوتی ہے، اور میں مجرم ہوں گا اگر جماعت کے اندر فتنہ پھیلانے کی اجازت دوں۔ جماعت بنانے کی غرض یہ تھی کہ ہم اپنی اصلاح اور دنیا کی اصلاح کے لیے ایک دوسرے کے معاون بنیں اور قوتوں کو مجتمع کر کے اس سے زیادہ کام کریں جو انفرادی طور پر الگ الگ کر سکتے تھے، نہ یہ کہ ایک دوسرے کے لیے عیب چیں، خوردہ گیر اور خارِ راہ بن جائیں اور جو کچھ ہم میں سے ایک شخص تنہا کر سکتا تھا اتنا بھی اسے نہ کرنے دیں۔

رفقائے جماعت کو میں ہدایت کرتا ہوں کہ اپنے میں سے جس شخص کو وہ انفرادی طور پر نجویٰ کرتے اور بددلی پھیلاتے دیکھیں اس کی باتیں سننے سے انکار کر دیں اور اسے مجبور کریں کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، افراد سے الگ الگ نہ کہے بلکہ مقامی جماعت کے اجتماع میں شریک ہو کر باقاعدہ اپنے اعتراضات بیان کرے۔ پھر اس کے اعتراضات اس کے سامنے ضبطِ تحریر میں لائے جائیں اور میرے پاس

بھیج دیے جائیں، میں جلوت کو اس کے اعتراضات کی حقیقت سے آگاہ کردوں گا۔ رفیقوں کو خوب جان لینا چاہیے کہ اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ۔ درصل شیطان ہی جو اس کام کو برباد کرنے کے لیے ایک ایک شخص کے پاس جا جا کر اسے کسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جماعت کا سامنا کرنے سے وہ بچتا ہے اور افراد کو الگ الگ شکار کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس کی چالوں کا مقابلہ کرنے کی یہی صورت ہے کہ انفرادی سرگوشیوں پہ کان بند کر لیے جائیں اور ہر اس شخص کو جو کسی چیز پر ناراض یا معترض ہو مجبور کر دیا جائے کہ یا تو وہ جماعت کے سامنے آکر اپنے اسباب ناراضی اور وجوہ اعتراض بیان کرے ورنہ جماعت سے الگ ہو جائے۔

جس قدر اعتراضات اب تک میرے علم میں آئے ہیں ان کی تہ میں چند خرابیاں کام کر رہی ہیں جن پر یہاں تنبیہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ بالعموم افرادِ جماعت کو انھی خرابیوں میں سے کسی نہ کسی کے ثمرات سے سابقہ پیش آئے گا۔

سب سے پہلی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اکثر لوگ اقامتِ دین کی تحریک کے لیے کسی ایسے مردِ کامل کو ڈھونڈتے ہیں جو ان میں سے ایک ایک شخص کے تصورِ کمال کا مجسمہ ہو اور جس کے سارے پہلو قوی ہی قوی ہوں، کوئی پہلو کمزور نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ لوگ در اصل نبی کے طالب ہیں، اگرچہ زبان سے ختمِ نبوت کا اقرار کرتے ہیں اور کوئی اجرائے نبوت کا نام بھی لے دے تو اس کی زبان گُدّی سے کھینچنے کے لیے تیار ہو جائیں، مگر اندر سے ان کے دل ایک نبی مانگتے ہیں اور نبی سے کم کسی پر راضی نہیں ہیں کہ اس کی قیادت میں دین کی اقامت کے لیے جدوجہد کریں۔ یہی ذہنیت ہے جس کی بدولت ایک گروہ "مردے از غیب" کے انتظار میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا اور ایک دوسرے گروہ نے آخر کار اجرائے نبوت کا ارتکاب کر ڈالا۔ بخلاف اس کے میں جس نظریہ پر کام کر رہا ہوں وہ اس ذہنیت کے بالکل برعکس ہے۔ مجھے اس امر کا کوئی ثبوت کتاب و سنت میں نہیں ملا کہ خدا کے دین کو قائم کرنے کے لیے مردِ کامل کا وجود شرط ہے اور وہ نہ ملے تو یہ فریضہ امت پر سے ساقط ہو جاتا ہے۔ میرے علم میں یہ کام بہر حال کرنے کا ہے، اگر مردِ کامل نہیں ملتا تو ہم مردانِ ناقص ہی کو مل کر اس کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر میں نے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں سے واقف ہونے کے باوجود دعوتِ دینی شروع کی تھی، اور جب یہ دعوت اس حد تک پختگی کو پہنچی کہ لوگوں کو جمع کر کے ایک منظم جتھہ بنانا ممکن ہو گیا تو میں نے رفقاء سفر سے اول روز ہی کہہ دیا تھا کہ نہ میں خود کامل ہوں، نہ آپ لوگوں میں سے کوئی کامل ہے، ہم میں سے ہر ایک کسی پہلو میں ناقص اور کسی دوسرے پہلو میں کامل یا قریب بکمال ہے، لہٰذا آیئے ہم مل کر ایک مردِ کامل بننے کی کوشش کریں

اگر ہم حتی الامکان ایک دوسرے کے نقائص کو دور کرنے میں معاونت کرتے اور ہم میں سے ہر ایک اپنے قوی پہلو سے دوسرے کے کمزور پہلو کی تلافی کرتا تو بحیثیتِ مجموعی ہماری یہ جماعت اس کمال کی حامل ہو جائے گی جس کے ساتھ ہم اللہ کا کلمہ بلند کر سکیں گے۔ لیکن افسوس کہ یہ نظریہ بہت کم لوگوں کے دلوں میں اتر سکا ہے اور بار بار کی فہمائش کے باوجود حال یہ ہے کہ بہت سے رفیق رہنمائی کے منصب پر ایک نبی مبعوث من اللہ کو ڈھونڈتے ہوئے آتے ہیں، خوردبین لگا لگا کر مجھے دیکھتے ہیں، پھر ہر ایک اپنے تصورِ کمال کے لحاظ سے ایک فہرست بنا کر میرے سامنے پیش کر دیتا ہے کہ یہ یہ خامیاں اپنے اندر سے نکالو اور یہ یہ صفات کمالیہ اپنے اندر پیدا کرو تب کام چلے گا، اور جب ہفتہ دو ہفتہ میں میرے اندر ان کے منشا کے مطابق انقلاب رونما نہیں ہو جاتا تو بس ان کے دل بیٹھنے لگتے ہیں اور خود ہی بیٹھنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے دل بٹھانے کی بھی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔

مجھے ان لوگوں کی نادانی پر افسوس ہوتا ہے، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان کے سوچنے کا انداز کیسے بدل دوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ مجھے ان سے وہ مدد ملتی ہے جس کا میں خود اپنی تکمیل کے لیے محتاج ہوں، نہ میں ان کے کمزور پہلوؤں کی تقویت کے لیے کچھ کر سکتا ہوں جن میں اللہ نے مجھ کو ان سے زیادہ قوت بخشی ہے، اور نہ اجتماعی قوت سے وہ طاقتور شخصیت ہی بننے پاتی ہے جو کوئی بڑا کام انجام دینے کے قابل ہو۔

اسی سلسلہ کی ایک اور خرابی یہ ہے کہ وہ مختلف عناصر جن سے اس جماعت کی ترکیب ہوئی ہے، ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے بمشکل آمادہ ہوتے ہیں۔ نہ ان میں اتنا صبر ہے کہ ہمدردی کے ساتھ ایک دوسرے کو سمجھیں اور بتدریج ایک دوسرے کی اصلاح و تربیت کریں، نہ اتنا انصاف ہے کہ اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی کمزوریوں کا اور دوسروں کی کمزوریوں کے ساتھ ان کی خوبیوں کا بھی احساس و اعتراف کریں، نہ اتنی لچک ہے کہ کسرِ و انکسار سے ایک متحد المزاج معجون بننے کے لیے تیار ہوں، نہ اتنا حسنِ ظن ہے کہ جو لوگ انھی کی طرح ایک دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے آئے ہیں ان کے عمل میں اگر کچھ کوتاہی پائیں تو اس کو ارادی فجور و عصیان یا قصدی غلط کاری کے سوا کسی اور سبب پر بھی محمول کر سکیں۔ ہر ایک جس طبقے سے آیا ہے اور جس رنگِ زندگی سے اب تک مانوس رہا ہے اسی میں پوری جماعت کو رنگا ہوا دیکھنا چاہتا ہے، اور اس سے مختلف رنگ دیکھ کر دل برداشتہ ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ یہ ذہنیت اس جماعت کے مزاج کے بالکل خلاف ہے اور اس کا نتیجہ پھر یہی ہو سکتا ہے کہ ایک ایک طبقے اور ایک ایک رنگ کے لوگ الگ الگ گروہ بن جائیں اور ہر ایک گروہ اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی ان کمزوریوں اور خامیوں کا بھی حامل رہے جن کی بدولت اب تک ہمارا کوئی گروہ اقامتِ دین کے لیے کوئی قابلِ ذکر سعی نہیں کر سکا ہے۔ ہماری اس جماعت کی خوبی یہ تھی کہ اس نے ایک کلمہ اور ایک نصب العین کی کشش سے تمام مختلف

طبقات کے لوگوں کو کھینچ کر یکجا کر لیا۔ ان میں وہ نئے طبقہ کے لوگ بھی ہیں جو جاہلیت جدیدہ میں غرق ہو چکے تھے اور اب اللہ نے ان کی آنکھیں کھول کر راہِ راست انہیں دکھا دی۔ ان میں وہ متوسط طبقہ کے لوگ بھی ہیں جو نئے اور پرانے رنگ کی مخلوط سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں وہ پرانے رنگ کے لوگ بھی ہیں جن میں کچھ شرعی صورت کی تقلید اور کچھ دورِ انحطاط کے قدامت پرستانہ تعصبات ملے جلے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک طبقہ اپنے اندر کچھ خوبیاں رکھتا ہے جو دوسرے طبقہ میں نہیں ہیں اور کچھ خرابیاں رکھتا ہے جن سے دوسرا طبقہ محفوظ ہے۔ ہماری اس جماعت کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ یہ سب مل کر باہمی رفاقت، صحبت اور تعاون سے بتدریج ایک دوسرے کی خرابیوں کو دور کرنے اور ایک دوسرے کی خوبیاں جذب کرنے کی کوشش کریں، اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ ان میں تحمل ہو، صبر ہو، ہمدردی ہو، انصاف ہو، لچک ہو، حسنِ ظن ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ اب تک یہ اسپرٹ بہت کم پیدا ہوئی ہے خصوصاً پرانے طرز کا طبقہ اس معاملہ میں دوسرے طبقوں کی بہ نسبت زیادہ شدت پسند ثابت ہو رہا ہے۔ یہ لوگ اپنی خوبیوں کا مبالغہ آمیز تصور رکھتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کو سمجھنے سے گریز کرتے ہیں، دوسروں کی خوبیوں کا اندازہ ہمیشہ کم لگاتے ہیں اور انہیں جذب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اور جس دینداری کو انہوں نے وراثتاً آسانی کے ساتھ پالیا ہے اس کا رنگ اُن لوگوں پر فوراً چڑھتے دیکھنا چاہتے ہیں جن کی زندگی کا بڑا حصہ ایک دوسرے رنگ میں گذر چکا ہے اور جنہیں نیا رنگ اختیار کرنے میں سخت مشکلات سے دوچار ہونا ہے۔ جہاں تک حقیقی دینداری کا تعلق ہے اس کی بہت سی خصوصیات سے یہ لوگ ابھی خود محروم ہیں کیونکہ وراثتہً انہیں وہ چیزیں نہیں ملیں، اور انہیں اختیار کرنا ان کے لیے بھی ویسا ہی مشکل ہو رہا ہے لیکن یہ دوسروں کی پوزیشن سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بہت جلدی دل برداشتہ ہو کر بھاگ نکلنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ابھی اس سلسلہ کی چند اور خرابیاں میری نگاہ میں ہیں جنہیں آئندہ اشاعت میں بیان کروں گا۔ یہاں مجلس شوریٰ کے دو مزید فیصلوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ پنجاب، یوپی، بہار اور دکن میں جماعت کی تنظیم کے لیے جو بڑے بڑے حلقے بنا کر نائبین امیر کو تفویض کیے گئے تھے، انہیں باستثناء حلقۂ دکن توڑ دیا گیا اور اب ان تمام حلقوں کی جماعتوں کا تعلق براہِ راست مرکز سے ہو گا۔ دوسرے یہ کہ مرکز میں تعمیری کام کا جو نقشہ میں نے بنایا تھا، اور جو ربیع الآخر کے ترجمان القرآن میں شائع ہو چکا ہے اس پر مجلس نے تفصیلی غور کیا اور اس سے اتفاق کر لیا۔

تفہیم القرآن

(۷)

آلِ عمران

(از رکوع ۱۰ تا ختم سورہ)

تم نیکی کا مقام نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنھیں تم عزیز رکھتے ہو[۷۴]، اور جو کچھ تم خرچ کروگے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔

کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعتِ محمدی میں حلال کی گئی ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں[۷۵]

---

[۷۴] اوپر سے جو سلسلۂ تقریر چلا آ رہا ہے اس میں خطاب کا رُخ یہودیوں کی طرف ہے۔ اس آیت میں ان کی اُس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے جو وہ "نیکی" کے بارے میں رکھتے تھے۔ ان کے دماغوں میں نیکی کا بلند سے بلند تصور بس یہ تھا کہ صدیوں کے توارث سے "تشرُّع" کی جو ایک خاص شکل ان کے ہاں بن گئی ہے اس کا پورا چربہ آدمی اپنی زندگی میں اُتار لے اور ان کے علماء کی قانونی موشگافیوں سے جو ایک لمبا چوڑا فقہی نظام بن گیا ہے اس کے مطابق رات دن زندگی کے چھوٹے چھوٹے ضمنی و فروعی معاملات کی ناپ تول کرتا رہے۔ اِس تشرّع کی ظاہری سطح کے نیچے بالعموم یہودیوں کے بڑے بڑے "دیندار" لوگ تنگ دلی، حرص، بخل، حق پوشی، اور حق فروشی کے عیوب چھپائے ہوئے تھے اور رائے عام ان کو نیک سمجھتی تھی۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے انھیں بتایا جا رہا ہے کہ "نیک انسان" ہونے کا مقام اُن چیزوں سے بالاتر ہے جن کو تم نے مدارِ خیر و صلاح سمجھ رکھا ہے۔ نیکی کی اصل روح خدا کی محبت ہے، ایسی محبت کہ رضائے الٰہی کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز عزیز تر نہ ہو۔ جس چیز کی محبت بھی آدمی کے دل پر اتنی غالب آجائے کہ وہ اسے خدا کی محبت پر قربان نہ کر سکتا ہو بس وہی بُت ہے اور جب تک اس بُت کو آدمی توڑ نہ دے، نیکی کے دروازے اس پر بند ہیں۔ اس رُوح سے خالی ہونے کے بعد ظاہری تشرّع کی حیثیت محض اُس چمکدار روغن کی سی ہے جو گھُن کھائی ہوئی لکڑی پر پھیر دیا گیا ہو۔ انسان ایسے روغنوں سے دھوکا کھا سکتے ہیں، مگر خدا نہیں کھا سکتا۔

[۷۵] قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر جب علماءِ یہود کوئی اصولی اعتراض نہ کر سکے (باقی صفحہ ۱۴ پر)

البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنہیں توراۃ کے نازل کیے جانے سے پہلے بنی اسرائیل ۷۶ نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ ان سے کہو اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچے ہو تو لاؤ توراۃ اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت۔ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے رہیں وہی درحقیقت ظالم ہیں۔ کہو، اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے، تم کو یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرنی چاہیے، اور ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ ۷۷

بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ ۷۸ اس کو خیر و برکت دی گئی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنا دیا گیا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ۷۹ ابراہیم کا مقامِ عبادت ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ ۸۰ لوگوں

(بقیہ صفحہ سابق) (کیونکہ اساس دین جن امور پر ہے اُن میں انبیاء سابقین کی تعلیمات اور نبی عربی کی تعلیم میں یکسر مو فرق نہ تھا تو انھوں نے فقہی اعتراضات شروع کیے۔ اس سلسلہ میں ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ آپ نے کھانے پینے کی بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو پچھلے انبیاء کے زمانہ سے حرام چلی آرہی ہیں۔ اسی اعتراض کا یہاں جواب دیا جا رہا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۷۶ "اسرائیل" سے مراد اگر بنی اسرائیل لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ نزولِ توراۃ سے قبل بعض چیزیں بنی اسرائیل نے محض رسماً حرام قرار دے رکھی تھیں۔ اور اگر اس سے مراد حضرت یعقوب لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنجناب نے بعض چیزوں سے طبعی کراہت کی بنا پر یا کسی مرض کی بنا پر احتراز فرمایا تھا اور ان کی اولاد نے بعد میں اُسے ممنوع سمجھ لیا۔ یہی موخر الذکر روایت زیادہ مشہور ہے۔

۷۷ مطلب یہ ہے کہ ان فقہی جزئیات میں کہاں جا پھنسے ہو۔ دین کی جڑ تو اللہ واحد کی بندگی ہے جسے تم نے چھوڑ دیا اور شرک کی آلائشوں میں مبتلا ہو گئے۔ اب بحث کرتے ہو فقہی مسائل میں، حالانکہ یہ وہ مسائل ہیں جو اصل ملتِ ابراہیمی سے ہٹ جانے کے بعد انحطاط کی طویل صدیوں میں تمہارے علماء کی موشگافیوں سے پیدا ہوئے ہیں۔

۷۸ یہودیوں کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تم نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا، حالانکہ پچھلے انبیاء کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ اس کا جواب سورۂ بقرہ میں دیا جا چکا ہے۔ لیکن یہودی اس کے بعد بھی اپنے اعتراض پر مُصِر رہے۔ لہٰذا یہاں پھر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ (حاشیہ ۷۹ و ۸۰ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اُسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

کہو، اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کہو، اے اہل کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اُسے بھی تم اللہ کے راستہ سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے حالانکہ تم خود (اس کے راہِ راست ہونے پر) گواہ ہو۔ تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔

اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمہارے لیے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقع باقی ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جارہی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے؟ جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہِ راست پالے گا۔ ع ۱۰

(بقیہ سابقہ) ؎ یعنی اس گھر میں ایسی صریح علامات پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جناب میں مقبول ہوا ہے اور اسے اللہ نے اپنے گھر کی حیثیت سے پسند فرما لیا ہے۔ لق و دق بیابان میں بنایا گیا اور پھر اللہ نے اس کے جوار میں رہنے والوں کی رزق رسانی کا بہتر سے بہتر انتظام کر دیا۔ دو ڈھائی ہزار برس تک جاہلیت کے سبب سے، تمام عرب انتہائی بدامنی کی حالت میں مبتلا رہا، مگر اس فساد بھری سرزمین میں کعبہ اور اطرافِ کعبہ ہی کا ایک خطہ ایسا تھا جس میں امن قائم رہا، بلکہ اسی کعبہ کی یہ برکت تھی کہ سال بھر میں چار مہینے کے لیے پورے ملک عرب کو اس کی بدولت امن میسر آجاتا تھا۔ پھر ابھی نصف صدی پہلے ہی سب دیکھ چکے تھے کہ ابرہہ، جس نے کعبہ کی تخریب کے لیے مکہ پر حملہ کیا تھا، اس کی فوج کس طرح قہر الٰہی کی شکار ہوئی۔ اس واقعہ سے اُس وقت عرب کا بچہ بچہ واقف تھا اور اس کے چشم دید شاہد تک ان آیات کے نزول کے وقت موجود تھے۔

؎ جاہلیت کے تاریک دور میں بھی اس گھر کا یہ احترام تھا کہ خون کے پیاسے دشمن ایک دوسرے کو وہاں دیکھتے تھے اور ایک کو دوسرے پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔[۱] سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو[۲] اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اُس نے تمھارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے، تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔[۳] اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمھارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمھیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔[۴]

---

[۱] یعنی مرتے دم تک اللہ کی فرماں برداری اور وفاداری پر قائم رہو۔

[۲] اللہ کی رسی سے مراد اس کا دین ہے، اور اس کو رسّی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہلِ ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ اس رسّی کو "مضبوط پکڑنے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیت "دین" کی ہو، اسی سے ان کو دلچسپی ہو، اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں، اور اسی کی خدمت کے لیے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور اُن کی توجہات اور دلچسپیاں جزئیات و فروع کی طرف منعطف ہوئیں، پھر ان میں لازماً وہی تفرقہ و اختلاف رونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی امتوں کو ان کے اصل مقصدِ حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے۔

[۳] یہ اشارہ ہے اُس حالت کی طرف جس میں اسلام سے پہلے اہلِ عرب مبتلا تھے۔ قبائل کی باہمی عداوتیں، بات بات پر ان کی لڑائیاں اور شب و روز کے کشت و خون جن کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جاتی۔ اس آگ میں جل مرنے سے اگر کسی چیز نے انھیں بچایا تو وہ یہی نعمت اسلام تھی۔ یہ آیات جس وقت نازل ہوئی ہیں اس سے تین چار سال پہلے ہی مدینہ کے لوگ مسلمان ہوئے تھے اور اسلام کی یہ جیتی جاگتی نعمت سب دیکھ رہے تھے کہ اَوس اور خزرج کے وہ قبیلے جو سالہا سال سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، باہم مل کر شیر و شکر ہو چکے تھے اور یہ دونوں قبیلے مکہ سے آنے والے مہاجرین کے ساتھ ایسے بے نظیر ایثار و محبت کا برتاؤ کر رہے تھے جو ایک خاندان کے لوگ بھی آپس میں نہیں کرتے۔ (حاشیہ [۴] اگلے صفحہ پر ہے)

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ کہیں تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے[۱۵]۔ جنھوں نے یہ روش اختیار کی وہ اس روز سخت سزا پائیں گے جبکہ کچھ لوگ سُرخ رو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہوگا۔ جن کا منہ کالا ہوگا ان سے کہا جائے گا کہ نعمتِ ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کافرانہ رویہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اس کفرانِ نعمت کے صلہ میں عذاب کا مزہ چکھو۔ رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو اُن کو اللہ کے دامنِ رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ وہ اسی حالت میں رہیں گے۔ یہ اللہ کے ارشادات ہیں جو ہم تمھیں ٹھیک ٹھیک سنا رہے ہیں کیونکہ اللہ دنیا والوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا[۱۶]۔ زمین و آسمان کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ ع ۱۱

(بقیہ سابق) ۱۴ یعنی اگر تم آنکھیں رکھتے ہو تو ان علامتوں کو دیکھ کر خود اندازہ کر سکتے ہو کہ آیا تمھاری فلاح اس دین کو مضبوط تھامنے میں ہے یا اسے چھوڑ کر پھر اسی حالت کی طرف پلٹ جانے میں جس کے اندر تم پہلے مبتلا تھے، آیا تمھارا اصلی خیر خواہ اللہ اور اس کا رسول ہے یا وہ یہودی اور مشرک اور منافق لوگ جو تم کو حالتِ سابقہ کی طرف پلٹائے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۵ یہ اشارہ ان امتوں کی طرف ہے جنھوں نے خدا کے پیغمبروں سے دینِ حق کی صاف اور سیدھی تعلیمات پائیں مگر کچھ مدت گزر جانے کے بعد اصل دین کو چھوڑ کر غیر متعلق ضمنی و فروعی مسائل کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنانے شروع کر دیے اور فضول و لایعنی باتوں پر جھگڑنے میں ایسے مشغول ہوئے کہ نہ انھیں اُس کام کا ہوش رہا جو اللہ نے ان کے سپرد کیا تھا اور نہ عقیدہ و اخلاق کے ان بنیادی اصولوں سے دلچسپی رہی جن پر درحقیقت انسان کی فلاح و سعادت کا مدار ہے۔

۱۶ یعنی چونکہ اللہ دنیا والوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا اس لیے وہ ان کو سیدھا راستہ بھی بتا رہا ہے اور اس بات سے بھی قبل از وقت آگاہ کیے دیتا ہے کہ آخر کار وہ کن امور پر اُن سے باز پرس کرنے والا ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ کج روی اختیار کریں اور اپنے غلط طرزِ عمل سے باز نہ آئیں وہ اپنے اوپر آپ ظلم کریں گے۔

اب[1] دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہلِ کتاب[2] ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایمان دار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔ یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔

یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے[3]۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی و مغلوبی مسلّط کر دی گئی ہے، اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔

مگر سارے اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہِ راست پر قائم

---

[1] یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ بقرہ کے سترھویں رکوع میں بیان ہو چکا ہے۔ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے بنی اسرائیل اپنی نااہلی کے باعث معزول کیے جا چکے ہیں اس پر اب تم مامور کیے گئے ہو، اس لیے کہ اخلاق و اعمال کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ بن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہو گئی ہیں جو امامت عادلہ کے لیے ضروری ہیں، یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ و عمل اور اللہ وحدہ لا شریک کو اعتقاداً و عملاً اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرنا۔ لہٰذا اب یہ کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے اور تمہیں لازم ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو اور ان غلطیوں سے بچو جو تمہارے پیش رَو کر چکے ہیں۔

[2] اشارہ ہے یہودیوں کی طرف۔

[3] یعنی دنیا میں اگر کہیں ان کو تھوڑا بہت امن چین نصیب بھی ہوا ہے تو وہ ان کے اپنے بل بوتے پر قائم کیا ہوا امن و چین نہیں ہے بلکہ دوسروں کے ماتحت ذمّی رعایا ہونے کی حیثیت سے ہے۔ کہیں کسی مسلم حکومت نے ان کو خدا کے نام پر امان دے دی اور کہیں کسی غیر مسلم حکومت نے اپنے طور پر انھیں اپنی حمایت میں لے لیا۔

ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی، اللہ پرہیزگار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلہ میں ان کو نہ ان کا مال کچھ کام دے گا نہ اولاد، وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں اور آگ ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی اس دنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں اس کی مثال اُس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ اُن لوگوں کی کھیتی پر چلے جنھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے[ملہ]۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، درحقیقت یہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔

اے ایمان لانے والو! اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ

ملہ اس مثال میں کھیتی سے مراد یہ کشتِ حیات ہے جس کی فصل آدمی کو آخرت میں کاٹنی ہے، ہوا سے مراد وہ اوپری جذبۂ خیر ہے جس کی بنا پر کفار رفاہِ عام کے کاموں اور خیرات وغیرہ میں دولت صرف کرتے ہیں، اور پالے سے مراد صحیح ایمان اور ضابطۂ خداوندی کی پیروی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے ان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تمثیل سے یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس طرح ہوا کھیتیوں کی پرورش کے لیے مفید ہے لیکن اگر اسی ہوا میں پالا ہو تو وہ کھیتی کو پرورش کرنے کے بجائے اسے تباہ کر ڈالتی ہے، اسی طرح خیرات بھی اگرچہ انسان کے مزرعۂ آخرت کو پرورش کرنے والی چیز ہے مگر جب اُسکے اندر کفر کا زہر ملا ہوا ہو تو یہی خیرات مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مہلک بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا مالک اللہ ہے اور اس مال کا مالک بھی اللہ ہی ہے جس میں انسان تصرف کر رہا ہے، اور یہ مملکت بھی اللہ ہی کی ہے جس کے اندر رہ کر انسان کام کر رہا ہے۔ اب اگر اللہ کا یہ غلام اپنے مالک کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتا یا اس کی بندگی کے ساتھ کسی اور کی ناجائز بندگی بھی شریک کرتا ہے، اور اللہ کے مال اور اس کی مملکت میں تصرف کرتے ہوئے اصل مالک کے قانون و ضابطہ کی اطاعت نہیں کرتا، تو اس کے یہ تمام تصرفات از سرتاپا جرم بن جاتے ہیں۔ اجر ملنا کیسا وہ تو اس کا مستحق ہے کہ ان تمام حرکات کے لیے اس پر فوجداری کا مقدمہ قائم کیا جائے۔

تمھاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔[سلہ] تمھیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض اُن کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمھیں صاف صاف ہدایات دیدی ہیں، اگر تم عقل رکھتے ہو (توان سے تعلق رکھنے میں احتیاط برتو گے)۔ تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام کتبِ آسمانی کو مانتے ہو[سلہ]۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی (تمھارے رسول اور تمھاری کتاب کو) مان لیا ہے، مگر جب جُدا ہوتے ہیں تو تمھارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا

سلہ مدینہ کے اطراف میں جو یہودی آباد تھے ان کے ساتھ اوس اور خزرج کے لوگوں کی قدیم زمانہ سے دوستی چلی آتی تھی۔ انفرادی طور پر بھی ان قبیلوں کے افراد اُن کے افراد سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے۔ جب اوس اور خزرج کے قبیلے مسلمان ہوگئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ وہی پُرانے تعلقات نباہتے رہے اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی محبت وخلوص کے ساتھ ملتے رہے۔ لیکن یہودیوں کو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مشن سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ محبت رکھنے کے لیے تیار نہ تھے جو اس نئی تحریک میں شامل ہوگیا ہو۔ انھوں نے انصار کے ساتھ ظاہر میں تو وہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آتے تھے، مگر دل میں وہ اب ان کے سخت دشمن ہو چکے تھے اور اس ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ وفساد برپا کردیں اور ان کے جماعتی راز معلوم کرکے ان کے دشمنوں تک پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ یہاں اُن کی اسی منافقانہ روش سے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔

سلہ یعنی یہ عجیب ماجرا ہے کہ شکایت بجائے اس کے کہ تمھیں اُن سے ہوتی، اُن کو تم سے ہے۔ تم تو قرآن کے ساتھ توراۃ کو بھی مانتے ہو اس لیے اُن کو تم سے شکایت ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوسکتی، البتہ شکایت اگر ہوسکتی تھی تو تمھیں اُن سے ہوسکتی تھی کیونکہ وہ قرآن کو نہیں مانتے۔

یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں ---- ان سے کہدو کہ اپنے غصہ میں آپ جل مرو،
اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ---- تمھارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو بُرا معلوم ہوتا ہے اور
تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی
بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس پر حاوی ہے۔ ع ۱۲
(اے پیغمبر! مسلمانوں کے سامنے اُس موقع کا ذکر کرو) جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے

سلہ یہاں سے چوتھا خطبہ شروع ہوتا ہے۔ یہ جنگِ احد کے بعد نازل ہوا اور اس میں جنگِ احد پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اوپر کے خطبہ سے اس خطبہ کا تعلق سمجھنے کے لیے اُس کے آخری فقرے پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اُس میں ارشاد ہوا ہے "ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو"۔ اب چونکہ اُحد میں مسلمانوں کی شکست کا سبب ہی یہ ہوا کہ ان کے اندر صبر کی بھی کمی تھی اور ان کے افراد سے بعض ایسی غلطیاں بھی سرزد ہوئی تھیں جو خدا ترسی کے خلاف تھیں، اس لیے یہ خطبہ جس میں انھیں اِن کمزوریوں پر تنبیہ کیا گیا ہے مندرجۂ بالا فقرے کے بعد ہی متصلاً درج کیا گیا۔

اس خطبہ کا اندازِ بیان یہ ہے کہ جنگِ اُحد کے سلسلہ میں جتنے اہم واقعات پیش آئے تھے اُن میں سے ایک ایک کو لے کر اس پر چند جچے تلے فقروں میں نہایت سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس کے واقعاتی پس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

شوال ۳ھ کی ابتدا میں کفارِ قریش تقریباً ۳ ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ تعداد کی کثرت کے علاوہ ان کے پاس ساز و سامان بھی مسلمانوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا، اور پھر وہ جنگِ بدر کے انتقام کا شدید جوش بھی رکھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تجربہ کار صحابہ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں محصور ہو کر مدافعت کی جائے۔ مگر چند نوجوانوں نے جو شہادت کے شوق سے بے تاب تھے اور جنھیں بدر کی جنگ میں شریک ہونے کا موقع نہ ملا تھا، باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ آخر کار ان کے اصرار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبور ہو کر باہر نکلنے ہی کا فیصلہ کر لیا۔ ایک ہزار آدمی آپ کے ساتھ نکلے۔ مگر مقامِ شوط پر پہنچ کر عبداللہ ابن اُبَی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ عین وقت پر اس کی اس حرکت سے مسلمانوں کے لشکر میں اچھا خاصا اضطراب پھیل گیا، حتیٰ کہ بنو سلمہ اور بنو حارثہ کے لوگ تو ایسے دل شکستہ ہوئے کہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)
انھوں نے بھی پلٹ جانے کا ارادہ کر لیا تھا، مگر پھر اولوالعزم صحابہ کی کوششوں سے یہ اضطراب رفع ہوگیا۔ ان باقی ماندہ سات سو آدمیوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور اُحد کی پہاڑی کے دامن میں (مدینہ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر) اپنی فوج کو اس طرح صف آرا کیا کہ پہاڑ پشت پر تھا اور قریش کا لشکر سامنے۔ پشت کی طرف صرف ایک درّہ ایسا تھا جس سے عقبی حملہ کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہاں آپ نے عبداللہ بن جبیر کے زیر قیادت پچاس تیر انداز بٹھا دیے اور ان کو تاکید کر دی کہ "کسی کو ہمارے قریب نہ پھٹکنے دینا، کسی حال میں یہاں سے نہ ہٹنا، اگر تم دیکھو کہ ہماری بوٹیاں پرندے نوچے لیے جاتے ہیں تب بھی تم اس جگہ سے نہ ٹلنا"۔ اس کے بعد جنگ شروع ہوئی۔ ابتداءً مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا یہاں تک کہ مقابل کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ لیکن اس ابتدائی کامیابی کو کامل فتح کی حد تک پہنچانے کے بجائے مسلمان مالِ غنیمت کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور انھوں نے دشمن کے لشکر کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اُدھر جن تیر اندازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا انھوں نے جو دیکھا کہ دشمن بھاگ نکلا ہے اور غنیمت لُٹ رہی ہے تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر غنیمت کی طرف لپکے۔ حضرت عبداللہ بن جبیر نے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تاکیدی حکم یاد دلا کر بہتیرا روکا مگر چند آدمیوں کے سوا کوئی نہ ٹھیرا۔ اس موقع سے خالد بن ولید نے جو اس وقت لشکر کفار کے رسالہ کی کمان کر رہے تھے بروقت فائدہ اُٹھایا اور پہاڑی کا چکر کاٹ کر عقب کے درہ سے حملہ کر دیا۔ عبداللہ بن جبیر نے جن کے ساتھ صرف چند ہی آدمی رہ گئے تھے، اس حملہ کو روکنا چاہا مگر مدافعت نہ کر سکے اور یہ سیلاب یکایک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ دوسری طرف جو دشمن بھاگ گئے تھے وہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہو گئے۔ اس طرح لڑائی کا پانسہ ایک دم پلٹ گیا اور مسلمان اس غیر متوقع صورتِ حال سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ ان کا ایک بڑا حصہ پراگندہ ہو کر بھاگ نکلا۔ تاہم چند بہادر سپاہی ابھی تک میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اتنے میں کہیں سے یہ افواہ اُڑ گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اس خبر نے صحابہ کے رہے سہے ہوش وحواس بھی گم کر دیے اور باقی ماندہ لوگ بھی ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد وپیش صرف دس بارہ جاں نثار رہ گئے تھے اور آپ خود زخمی ہو چکے تھے۔ شکست کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی لیکن عین وقت پر صحابہ کو معلوم ہوگیا کہ آنحضرت صلعم زندہ ہیں، چنانچہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر پھر آپ کے گرد جمع ہو گئے اور آپ کو بسلامت پہاڑی کی طرف لے گئے۔ اس موقع پر یہ ایک معما ہے جو حل نہیں ہو سکا کہ وہ کیا چیز تھی جس نے کفار مکہ کو خود بخود واپس پھیر دیا۔ مسلمان اس قدر پراگندہ ہو چکے تھے کہ ان کا پھر مجتمع ہو کر باقاعدہ جنگ کرنا مشکل تھا۔ اگر کفار اپنی فتح کو کمال تک پہنچانے پر اصرار کرتے تو ان کی کامیابی بعید نہ تھی۔ مگر نہ معلوم کس طرح وہ آپ ہی آپ میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

نکلے تھے اور (اُحد کے میدان میں) مسلمانوں کو جنگ کے لیے جا بجا مامور کر رہے تھے۔ اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور وہ نہایت باخبر ہے۔ (وہ اُس وقت بے خبر نہ تھا) جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے[۵۱] حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمھاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔

(انھیں اس وقت کی بات یاد دلاؤ) جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے "کیا تمھارے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اُتار کر تمھاری مدد کرے؟"[۵۲] — بے شک، اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمھارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اُسی آن تمھارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحبِ نشان فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمھیں اس لیے بتا دی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمھارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے (اور یہ مدد وہ تمھیں اس لیے دے گا) تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔

(اے پیغمبر!) فیصلہ کے اختیارات میں تمھارا کوئی حصہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انھیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُس کا مالک اللہ ہے، جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے۔ وہ معاف کرنے والا اور

---

[۵۱] یہ اشارہ ہے بنو سلمہ اور بنو حارثہ کی طرف جن کی ہمتیں عبد اللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں کی واپسی کے بعد پست ہو گئی تھیں۔

[۵۲] مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ایک طرف دشمن تین ہزار ہیں اور ہمارے ایک ہزار میں سے بھی تین سو الگ ہو گئے ہیں تو ان کے دل ٹوٹنے لگے۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے یہ الفاظ کہے تھے۔

رحیم ہے ۔ سلہ ۱۳۰آ

اے ایمان لانے والو! سود در سود کھانا چھوڑ دو سلہ اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اُس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کا حکم مان لو، توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ دوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اور وہ اُن خداترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ۔۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں سلہ ۔۔ اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں ۔۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے

سلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب زخمی ہوئے تو آپ کے منہ سے کفار کے حق میں بددعا نکل گئی اور آپ نے فرمایا کہ "وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کو زخمی کرے"۔ یہ آیات اسی کے جواب میں ارشاد ہوئی ہیں۔

سلہ اُحد کی شکست کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین کامیابی کے موقع پر مال کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور اپنے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے بجائے غنیمت لوٹنے لگے۔ اس لیے حکیم مطلق نے اس حالت کی اصلاح کے لیے طمع زر کے سرچشمے پر بند باندھنا ضروری سمجھا۔ سود کے ناپسندیدہ ہونے کا اظہار تو ہجرت سے پہلے مکے ہی میں کیا جا چکا تھا (ملاحظہ ہو سورۂ روم، رکوع ۴) اب اس کی قانونی ممانعت کی ابتدا ہوتی ہے اور سب سے پہلے شرح سود پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ عرب میں سود در سود کی دو صورتیں رائج تھیں۔ ایک یہ کہ جب کوئی شخص ایک خاص شرح سود پر کسی سے قرض لیتا اور مدت مقررہ پوری ہونے تک اسے ادا نہ کرتا تو اس کو مزید مہلت دینے کے لیے شرح سود میں اضافہ کر دیا جاتا۔ دوسری یہ کہ ایک مدت تک جب سود ادا نہ ہوتا تو وصول طلب سود کو اصل میں شامل کر کے پھر اس پر سود لگا دیا جاتا۔ اس موقع پر صرف اسی نوعیت کے معاملات کو حرام کیا گیا۔ سود کی کلی ممانعت (جس کا حکم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے) اس کے چند سال بعد ہوئی جبکہ تقریباً پورا ملک عرب اسلام کے زیر نگیں آچکا تھا اور ملک کے معاشی نظام کو بالکلیہ بدل دینا ممکن ہو گیا تھا۔

سلہ سود خواری جس سوسائٹی میں موجود ہوتی ہے اس کے اندر سود خواری کی وجہ سے (باقی اگلے صفحہ پر)

جو گناہ معاف کر سکتا ہو ۔۔۔ اور دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے[ا] ۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔

تم سے پہلے بہت سے دور گذر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنھوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو) جھٹلایا[۲] ۔ یہ لوگوں کے لیے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کیلیے ہدایت اور نصیحت۔ دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب ہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمھارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے[۳] ۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں[۴] ۔ کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں ۔۔۔ اور وہ اس آزمائش کے ذریعہ سے سچے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ

(بقیہ سابق) دو قسم کے اخلاقی اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ سود لینے والوں میں حرص و طمع بخل اور خود غرضی۔ اور سود دینے والوں میں نفرت، غصہ اور ناراضی۔ احد کی شکست میں ان تمام اثرات کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل تھا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ سود خواری سے فریقین میں جو اخلاقی اوصاف پیدا ہوتے ہیں ان کے بالکل برعکس انفاق فی سبیل اللہ سے یہ دوسری قسم کے اوصاف پیدا ہوا کرتے ہیں اور اللہ کی بخشش اور اس کی جنت اسی دوسری قسم کے اوصاف سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [ا] جو لوگ اب تک سود در سود کا ظالمانہ کاروبار کرتے رہے ہیں ان کو امید دلائی جا رہی ہے کہ اگر تم اب جان لینے کے بعد کہ اللہ کو یہ کاروبار پسند نہیں ہے اس سے باز آجاؤ اور اپنے گناہ پر اصرار نہ کرو تو پہلے جو کچھ کرتے رہے ہو اسے اللہ معاف کر دیگا۔

[۲] یہ تنبیہ ہے اس بات پر کہ اگر اللہ کا حکم سن لینے کے بعد بھی تم وہی کچھ کرتے رہے جو اب تک کرتے رہے ہو تو اس انجام کے لیے تیار ہو جاؤ جو تم سے پہلے نافرمانوں کا ہو چکا ہے۔

[۳] اشارہ ہے جنگ بدر کی طرف۔ اور کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب اس چوٹ کو کھا کر کافر پست ہمت نہ ہوئے تو اس چوٹ پر تم کیوں ہمت ہارو۔

[۴] اصل الفاظ ہیں ویتخذ منکم شہداء۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم میں سے کچھ شہید لینا چاہتا تھا یعنی کچھ لوگوں کو شہادت کی عزت بخشنا چاہتا تھا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اور منافقین کے اس مخلوط گروہ میں سے جس پر تم اس وقت مشتمل ہو، ان لوگوں کو الگ چھانٹ لینا چاہتا تھا جو حقیقت میں شہداء علی الناس ہیں، یعنی اس منصب جلیل کے اہل ہیں جس پر ہم نے امت مسلمہ کو سرفراز کیا ہے۔

تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم تو موت کی تمنائیں کر رہے تھے! مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی، لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی اور تم نے اسے آنکھوں دیکھ لیا۔^ع ۱۴

محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، اُن سے پہلے اور رسول بھی گذر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو اُلٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دیگا۔ کوئی ذی روح اللہ کے اِذن کے بغیر نہیں مر سکتا، موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔ جو شخص ثواب دنیا کے ارادہ سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے ارادہ سے کام

۱؎ اشارہ ہے شہادت کے اُن تمناؤں کی طرف جن کے اصرار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔

۲؎ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو اکثر صحابہ کی ہمتیں چھوٹ گئیں۔ اس حالت میں منافقین نے (جو مسلمانوں کے ساتھ ہی لگے ہوئے تھے) کہنا شروع کیا کہ چلو عبداللہ بن اُبی کے پاس چلیں تاکہ وہ ہمارے لیے ابو سفیان سے امان لے دے۔ اور بعض نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر محمدؐ خدا کے رسول ہوتے تو قتل کیسے ہوتے، چلو اب دینِ آبائی کی طرف لوٹ چلیں۔ انہی باتوں کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر تمہاری "حق پرستی" محض محمدؐ کی شخصیت سے وابستہ ہے اور تمہارا اسلام ایسا سست بنیاد ہے کہ محمدؐ کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی تم اسی کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے جس سے نکل کر آئے تھے تو اللہ کے دین کو تمہاری ضرورت نہیں ہے۔

۳؎ اس سے یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ موت کے خوف سے تمہارا بھاگنا فضول ہے۔ کوئی شخص نہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوئے وقت سے پہلے مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے۔ لہٰذا تم کو فکر موت سے بچنے کی نہیں بلکہ اس بات کی کرنی چاہیے کہ زندگی کی جو مہلت بھی تمہیں حاصل ہے اس میں تمہاری سعی و جہد کا مقصود کیا ہے، دنیا یا آخرت؟

۴؎ ثواب کے معنی ہیں نتیجۂ عمل۔ ثوابِ دنیا سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نتیجہ میں اسی دنیا کی زندگی میں حاصل ہوں۔ اور ثوابِ آخرت سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو اسی سعی و عمل کے نتیجہ میں (باقی اگلے صفحہ پر)

کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں[۱۰۵] کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انھوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے[۱۰۶]۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ مالک! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگذر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اُسے

(بقیہ سابق) آخرت کی پائیدار زندگی میں حاصل ہوں گے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے انسانی اخلاق کے معاملہ میں فیصلہ کُن سوال یہی ہے کہ کارزارِ حیات میں آدمی جو دوڑ دھوپ کر رہا ہے اس میں آیا وہ دنیوی نتائج پر نگاہ رکھتا ہے یا اُخروی نتائج پر۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۰۵ "شکر کرنے والوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی اِس نعمت کے قدر شناس ہوں کہ اُس نے دین کی صحیح تعلیم دے کر انھیں دنیا اور اس کی محدود زندگی سے بہت زیادہ وسیع، ایک ناپیدا کنار عالم کی خبر دی اور انھیں اس حقیقت سے آگاہی بخشی کہ انسانی سعی و عمل کے نتائج صرف اِس دنیا کی چند سالہ زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ اِس زندگی کے بعد ایک دوسرے عالم تک ان کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔ یہ وسعتِ نظر اور یہ دوربینی وعاقبت اندیشی حاصل ہو جانے کے بعد جو شخص اپنی کوششوں اور محنتوں کو اس دنیوی زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں بار آور ہوتے نہ دیکھے، یا ان کا برعکس نتیجہ نکلتا دیکھے اور اس کے باوجود اللہ کے بھروسہ پر وہ کام کرتا چلا جائے جس کے متعلق اللہ نے اسے یقین دلایا ہے کہ بہرحال آخرت میں اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلے گا، وہ شکر گزار بندہ ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اِس کے بعد بھی دنیا پرستی کی تنگ نظری میں مبتلا رہیں اور جن کا حال یہ ہو کہ دنیا میں جن غلط کوششوں کے بظاہر اچھے نتائج نکلتے نظر آئیں ان کی طرف وہ آخرت کے بُرے نتائج کی پروا کیے بغیر جُھک پڑیں اور جن صحیح کوششوں کے یہاں بار آور ہونے کی امید نہ ہو یا جن سے یہاں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اُن میں آخرت کے نتائج خیر کی امید پر اپنا وقت، اپنے مال اور اپنی قوتیں صرف کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، وہ ناشکرے ہیں اور اُس علم کے ناقدر شناس ہیں جو اللہ نے انھیں بخشا ہے۔

۱۰۶ یعنی اپنی قلّت تعداد اور بے سروسامانی، اور کفار کی کثرت اور زور آوری دیکھ کر انھوں نے باطل پرستوں کے آگے سپر نہیں ڈالی۔

معاف کردے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔" آخر کار اللہ نے ان کو
ع ۱۵ دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔

اے ایمان لانے والو! اگر تم اُن لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو اُلٹا پھیر لے جائیں گے[۱] اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔ (ان کی باتیں غلط ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمھارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرینِ حق کے دلوں میں رعب بٹھا دیں گے، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اُن کو خدائی میں شریک ٹھیرایا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی، اُن کا آخری ٹھکانا جہنم ہے اور کیسی بُری قیام گاہ ہے جو ان ظالموں کو نصیب ہو گی۔

اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے ــــ اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے ــــ تب اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمھیں معاف ہی کر دیا[۲] کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرِ عنایت رکھتا ہے (ذرا یاد

---

[۱] یعنی جس کفر کی حالت سے تم نکل کر آئے ہو اسی میں یہ تمھیں پھر واپس لے جائیں گے۔ منافقین اور یہودی اُحد کی شکست کے بعد مسلمانوں میں یہ خیال پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ محمدؐ اگر واقعی نبی ہوتے تو شکست کیوں کھاتے۔ یہ تو ایک معمولی آدمی ہیں ان کا معاملہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح ہے۔ آج فتح ہے تو کل شکست۔ خدا کی جس حمایت و نصرت کا انھوں نے تم کو یقین دلا رکھا ہے وہ محض ایک ڈھونگ ہے۔

[۲] یعنی تم نے غلطی تو ایسی کی تھی کہ اگر اللہ تمھیں معاف نہ کر دیتا تو اس وقت تمھارا استیصال ہو جاتا۔ یہ اللہ کا فضل تھا اور اس کی تائید و حمایت تھی جس کی بدولت تمھارے دشمن تم پر قابو پا لینے کے بعد ہوش گم کر بیٹھے اور بلا وجہ خود لپسپا ہو کر چلے گئے۔

کر وہ وقت) جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمھیں نہ تھا اور رسول تمھارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا[۱]۔ اس وقت تمھاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمھیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے[۲] تاکہ آئندہ کے لیے تمھیں یہ سبق ملے اور جو کچھ تمھارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اُس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمھارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اُونگھنے لگے[۳]۔ مگر ایک دوسرا گروہ جس کے لیے ساری اہمیت بس اپنے مفاد ہی کی تھی، اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلافِ حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ "اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟" ان سے کہو "(کسی کا کوئی حصہ نہیں) اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں"۔ دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں اُسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ "اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے"۔ ان سے کہدو کہ "اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے"

---

[۱] جب مسلمانوں پر عقب سے اور سامنے سے بیک وقت حملہ ہوا اور ان کی صفوں میں ابتری پھیل گئی تو کچھ لوگ مدینہ کی طرف بھاگ نکلے اور کچھ اُحد پر چڑھ گئے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک انچ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ دشمنوں کا چاروں طرف ہجوم تھا، دس بارہ آدمیوں کی مٹھی بھر جماعت پاس رہ گئی تھی، مگر اللہ کا رسول اس نازک موقع پر بھی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جما ہوا تھا اور بھاگنے والوں کو پکار رہا تھا الیّ عباد اللہ، الیّ عباد اللہ، اللہ کے بندو میری طرف آؤ، اللہ کے بندو میری طرف آؤ۔

[۲] رنج ہزیمت کا، رنج اس خبر کا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، رنج اپنے کثیر التعداد مقتولوں اور مجروحوں کا، رنج اس بات کا کہ اب گھروں کی بھی خیر نہیں، تین ہزار دشمن، جن کی تعداد مدینہ کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ ہے، شکست خوردہ فوج کو روندتے ہوئے قصبہ میں آگھسیں گے اور سب کو تباہ کر دیں گے۔

[۳] یہ ایک عجیب تجربہ تھا جو اُس وقت لشکرِ اسلام کے بعض لوگوں کو پیش آیا۔ حضرت ابوطلحہ جو اس جنگ میں شریک تھے خود بیان کرتے ہیں کہ اس حالت میں ہم پر اُونگھ کا ایسا غلبہ ہو رہا تھا کہ تلواریں ہاتھ سے چھوٹ پڑتی تھیں۔

اور یہ معاملہ جو پیش آیا، یہ تو اس لیے تھا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اُسے آزما لے اور جو کھوٹ تمھارے دلوں میں ہے اُسے چھانٹ دے، اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے اُن کے قدم ڈگمگا دیے تھے۔ اللہ نے انھیں معاف کر دیا، اللہ بہت درگذر کرنے والا اور بُردبار ہے۔ ع ۱۶

اے ایمان لانے والو! کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے[1]، ورنہ دراصل مارنے اور جِلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمھاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمھارے حصہ میں آئے گی وہ اُن ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنھیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔

(اے پیغمبر!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خُو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو، البتہ جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اُسی کے بھروسے

---

[1] یعنی یہ باتیں حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قضاء الٰہی کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی، مگر جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور سب کچھ اپنی تدبیروں ہی پر موقوف سمجھتے ہیں ان کے لیے اس قسم کے قیاسات بس داغِ حسرت بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں کہ کاش یوں ہوتا تو یہ ہو جاتا۔

پر کام کرتے ہیں۔ اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمھیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کر سکتا ہو۔ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے[له] اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا، پھر ہر متنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو وہ اس شخص کے سے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانا وہ بدترین ٹھکانا ہو جسے جہنم کہتے ہیں؟ اللہ کے نزدیک دونوں قسم کے آدمیوں میں بدرجہا فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔ درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انھی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اُس کی آیات انھیں سناتا ہے، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور اُن کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

اور یہ تمھارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آ پڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟[له] حالانکہ (جنگ

له جن تیر اندازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا انھوں نے جب دیکھا کہ دشمن کا لشکر لُٹا جا رہا ہے تو اُن کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ساری غنیمت انھی لوگوں کو نہ مل جائے جو اسے لوٹ رہے ہیں اور ہم تقسیم کے موقع پر محروم نہ رکھے جائیں۔ اسی بنا پر انھوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو آپ نے اُن لوگوں کو بلا کر اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے جواب میں کچھ عذرات پیش کیے جو نہایت کمزور تھے۔ اس پر حضور نے فرمایا بل ظننتم انا نغل ولا نقسم لکم "اصل بات یہ ہے کہ تم کو ہم پر اطمینان نہ تھا، تم نے یہ گمان کیا کہ ہم تمھارے ساتھ خیانت کریں گے اور تم کو حصہ نہیں دیں گے"۔ اس آیت کا اشارہ اسی معاملہ کی طرف ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب تمھاری فوج کا کمانڈر خود اللہ کا نبی تھا اور سارے معاملات اس کے ہاتھ میں تھے تو تمھارے دل میں یہ اندیشہ پیدا کیسے ہوا کہ نبی کے ہاتھ میں تمھارا مفاد محفوظ نہ ہوگا۔ کیا خدا کے پیغمبر سے یہ توقع رکھتے ہو کہ جو مال اس کی نگرانی میں ہو وہ دیانت، امانت اور انصاف کے سوا کسی اور طریقہ سے بھی تقسیم ہو سکتا ہے؟ (باقی اگلے صفحہ پر)

بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریقِ مخالف پر) پڑ چکی ہے[۱۱]۔ اے نبی! ان سے کہو، یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے[۱۲]، اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۱۳]، جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اِذن سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون۔ وہ منافق کہ جب ان سے کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو، تو کہنے لگے اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے[۱۴]۔ یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اُس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور اِن کے جو بھائی بند لڑنے گئے اور مارے گئے ان کے متعلق انھوں نے کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے

(بقیہ سابق) ۱۰ اکابر صحابہ تو خیر حقیقت شناس تھے اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو سکتے تھے، مگر عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ جب اللہ کا رسول ہمارے درمیان موجود ہے اور اللہ کی تائید و نصرت ہمارے ساتھ ہے تو کسی حال میں کفار ہم پر فتح پا ہی نہیں سکتے۔ اس لیے جب اُحد میں ان کو شکست ہوئی تو ان کی توقعات کو سخت صدمہ پہنچا اور انھوں نے حیران ہو کر پوچھنا شروع کیا کہ یہ کیا ہوا؟ اللہ کے دین کی خاطر ہم لڑیں، اللہ کا وعدۂ نصرت ہمارے ساتھ ہو، اللہ کا رسول خود اِس جنگ میں موجود ہو اور پھر بھی ہم شکست کھائیں؟ اور شکست بھی اُن سے جو اللہ کے دین کو مٹانے آئے ہوں؟ یہ آیات اسی حیرانی کو دور کرنے کیلیے ارشاد ہوئی ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱۱ جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے ۷۰ آدمی شہید ہوئے۔ بخلاف اس کے جنگِ بدر میں کفار کے ۷۰ آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور ۷۰ آدمی گرفتار ہو کر آئے تھے۔

۱۲ یعنی یہ تمہاری اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ تم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا، بعض کام تقویٰ کے خلاف کیے، حکم کی خلاف ورزی کی، مال کی طمع میں مبتلا ہوئے، آپس میں نزاع و اختلاف کیا، پھر کیوں پوچھتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی؟

۱۳ یعنی اللہ اگر تمھیں فتح دینے کی قدرت رکھتا ہے تو شکست دلوانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

۱۴ عبداللہ بن اُبَی جب تین سو منافقوں کو اپنے ساتھ لے کر راستہ سے پلٹنے لگا تو بعض مسلمانوں نے جا کر اُسے سمجھانے کی کوشش کی اور ساتھ چلنے کے لیے راضی کرنا چاہا۔ مگر اس نے جواب دیا کہ ہمیں یقین ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

تو نہ مارے جاتے۔ ان سے کہو اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو خود تمھاری موت جب آئے اُسے

ٹال کر دکھا دینا۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے

رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں[۱]، اور

مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں اُن کے لیے

بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شادان و فرحاں ہیں

اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ ع۱۷

جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا اُن میں جو اشخاص نیکوکار

اور پرہیزگار ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے[۲]۔ اور وہ جن[۳] سے لوگوں نے کہا کہ تمھارے خلاف بڑی فوجیں

جمع ہوئی ہیں، ان سے ڈرو، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے

(بقیہ سابق) آج جنگ نہیں ہوگی، اس لیے ہم جا رہے ہیں، ورنہ اگر ہمیں توقع ہوتی کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] مسند احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مروی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ جو شخص نیک عمل لیکر دنیا سے جاتا ہے اسے اللہ کے ہاں اس قدر پُرلطف اور پُرکیف زندگی میسر آتی ہے جس کے بعد وہ کبھی دنیا میں واپس آنے کی تمنا نہیں کرتا، مگر شہید اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ تمنا کرتا ہے کہ پھر دنیا میں بھیجا جائے اور پھر اُس لذت، اُس سرور اور اُس نشے سے بہرہ یاب ہو جو راہِ خدا میں جان دینے سے حاصل ہوتا ہے۔

[۲] جنگِ اُحد سے پلٹ کر جب مشرکین کئی منزل دور چلے گئے تو انھیں ہوش آیا اور انھوں نے آپس میں کہا یہ ہم نے کیا حرکت کی کہ محمدؐ کی طاقت کو توڑ دینے کا جو بیش قیمت موقع ملا تھا اُسے کھو کر چلے آئے۔ چنانچہ ایک جگہ ٹھیر کر انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مدینہ پر فوراً ہی دوسرا حملہ کر دیا جائے۔ لیکن پھر ہمت نہ پڑی اور مکہ واپس چلے گئے۔ ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ گمان تھا کہ یہ لوگ شاید پھر نہ پلٹ آئیں۔ اس لیے جنگِ اُحد کے دوسرے ہی دن آپ نے

(باقی اگلے صفحہ پر)

اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ آخر کار وہ اللہ کی عنایت سے اِس طرح پلٹ آئے کہ ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انھیں حاصل ہو گیا، اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ اب تمھیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں کو خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔ لہٰذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحبِ ایمان ہو۔

(اے پیغمبرؐ!) جو لوگ آج کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمھیں آزردہ نہ کریں، یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے،

(بقیہ سابق) مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کفار کے تعاقب میں چلنا چاہیے۔ یہ اگرچہ نہایت نازک موقع تھا مگر پھر بھی جو سچے مومن تھے وہ جان نثار کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حمراء الاسد تک گئے جو مدینہ سے ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس آیت کا اشارہ انہی فداکاروں کی طرف ہے۔

۱۲۳ یہ چند آیات جنگِ احد کے ایک سال بعد نازل ہوئی تھیں مگر چونکہ ان کا تعلق اُحد ہی کے سلسلۂ واقعات سے تھا اس لیے ان کو بھی اس خطبہ میں شامل کر دیا گیا۔ اُحد سے پلٹتے ہوئے ابوسفیان چیلنج دے گیا تھا کہ آئندہ سال بدر میں ہمارا تمھارا پھر مقابلہ ہو گا مگر جب مقابلہ کا وقت قریب آیا تو اس کی ہمت نے جواب دے دیا کیونکہ اُس سال مکہ میں قحط تھا۔ لہٰذا اس نے پہلو بچانے کے لیے یہ تدبیر کی کہ خفیہ طور پر ایک شخص کو بھیجا جس نے مدینہ پہنچ کر مسلمانوں میں یہ خبریں مشہور کرنی شروع کیں کہ اب کے سال قریش نے بڑی زبردست تیاری کی ہے اور ایسا بھاری لشکر جمع کر رہے ہیں جس کا مقابلہ تمام عرب میں کوئی نہ کر سکے گا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلمان خوف زدہ ہو کر اپنی جگہ رہ جائیں اور مقابلہ پر نہ آنے کی ذمہ داری انھی پر رہے۔ ابوسفیان کی اس چال کا یہ اثر ہوا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی طرف چلنے کے لیے مسلمانوں سے اپیل کی تو اس کا کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔ آخر کار اللہ کے رسول نے بھرے مجمع میں اعلان کر دیا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں اکیلا جاؤں گا۔ اس پر ۱۵۰۰ فداکار آپ کے ساتھ چلنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور آپ انھی کو لے کر بدر تشریف لے گئے۔ اُدھر سے ابوسفیان دو ہزار کی جمعیت لے کر چلا مگر دو روز کی مسافت تک جا کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سال لڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، آئندہ سال آئیں گے چنانچہ وہ اور اس کے ساتھی واپس ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۸ روز تک بدر کے مقام پر اس کے انتظار میں مقیم رہے اور اس دوران میں آپ کے ساتھیوں نے ایک تجارتی قافلہ کے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔ جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں (آپ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں) اور ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔ یہ ڈھیل جو ہم انھیں دیے جاتے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں، ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارِ گناہ سمیٹ لیں، پھر ان کے لیے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔

اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دیگا جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو۔[۱۲۰] وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کر دے۔[۱۲۱] غیب کی باتیں بتانے کے لیے تو وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے، لہٰذا (امورِ غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے۔ نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بُری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے[۱۲۲] اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے با خبر ہے۔ ع۱۸

(بقیہ سابق) کاروبار کر کے خوب مالی فائدہ اٹھایا۔ پھر جب یہ خبر معلوم ہو گئی کہ کفار واپس چلے گئے تو آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱۲۰] یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی جماعت کو اس حال میں دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ ان کے درمیان سچے اہلِ ایمان اور منافق، سب خلط ملط ہیں۔

[۱۲۱] یعنی مومن و منافق کی تمیز نمایاں کرنے کے لیے اللہ یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا کہ غیب سے تم کو دلوں کا حال بتا دے کہ فلاں مومن ہے اور فلاں منافق، بلکہ اس کے حکم سے ایسے امتحان کے مواقع پیش آئیں گے جن میں تجربہ سے مومن اور منافق کا حال کھل جائیگا۔

[۱۲۲] یعنی زمین و آسمان کی جو چیز بھی کوئی مخلوق استعمال کر رہی ہے وہ دراصل اللہ کی مِلک ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

اللہ نے اُن لوگوں کا قول سُنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں[1]۔ ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے (جب فیصلہ کا وقت آئے گا اُس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو اب عذابِ جہنم کا مزا چکھو، یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، اللہ اپنے بندوں کے لیے ظالم نہیں ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں "اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی کو رسول تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھائے[2]" اُن سے کہو تمھارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو، پھر اگر (ایمان لانے کے لیے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو ان کو تم نے کیوں قتل کیا؟ اب اگر یہ لوگ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔ آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو، لہذا اصلی کامیابی اس کی ہے جو وہاں آتشِ دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے، رہی یہ دنیا تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے[3]۔

(بقیہ سابق) اور اس پر مخلوق کا قبضہ وتصرف عارضی ہے۔ ہر ایک کو اپنے مقبوضات سے بہر حال بے دخل ہونا ہے اور آخر کار سب کچھ اللہ ہی کے پاس رہ جانے والا ہے۔ لہذا عقلمند ہے وہ جو اس عارضی قبضہ کے دوران میں اللہ کے مال کو اللہ کی راہ میں دل کھول کر صرف کرتا ہے اور سخت بے وقوف ہے وہ جو اسے بچا بچا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ یہودیوں کا قول ہے۔ قرآن مجید کی آیت مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا (کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے) پر طعن کرتے ہوئے وہ اس قسم کی باتیں کہا کرتے تھے۔

[2] یعنی وہ ہمارے سامنے کسی جانور کو قربان کرے اور ہماری آنکھوں دیکھتے ایک آگ غیب سے نمودار ہو کر اسے بھسم کر ڈالے جس سے ثابت ہو کہ واقعی یہ شخص خدا کی طرف سے آیا ہے۔

[3] یعنی اس دنیا کی زندگی میں جو نتائج رونما ہوتے ہیں انھی کو اگر کوئی شخص اصلی اور آخری نتائج (باقی اگلے صفحہ پر)

مسلمانو! تمھیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی، اور تم اہلِ کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے، اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو[۵] تو یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے۔ ان اہلِ کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمھیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہو گا، انھیں پوشیدہ رکھنا نہیں ہو گا۔[۲] مگر انھوں نے کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اُسے بیچ ڈالا۔ کتنا بُرا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ تم اُن لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسے کاموں کی تعریف انھیں حاصل ہو جو فی الواقع انھوں نے نہیں کیے ہیں۔[۳] حقیقت میں ان کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ زمین اور آسمان

ع ۱۹ کا مالک اللہ ہے اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے۔

[۴] زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوشمند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی

(بقیہ صفحہ سابق) سمجھ بیٹھے اور انھیں حق و باطل اور فلاح و خسران کا معیار قرار دے لے تو درحقیقت وہ سخت دھوکہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہاں کسی پر نعمتوں کی بارش ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہی حق پر بھی ہے اور اسی کو اللہ کی بارگاہ میں قبولیت بھی حاصل ہے۔ اور اسی طرح یہاں کسی کا مصائب و مشکلات میں مبتلا ہونا بھی لازمی طور پر یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ باطل پر ہے اور مردودِ بارگاہِ الٰہی ہے۔ اکثر اوقات اس ابتدائی مرحلہ کے نتائج اُن آخری نتائج کے برعکس ہوتے ہیں جو حیاتِ ابدی کے مرحلہ میں پیش آنے والے ہیں اور اصل اعتبار اُنہی نتائج کا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی ان کے طعن و تشنیع، ان کے الزامات، ان کے بیہودہ طرزِ کلام اور ان کی جھوٹی نشر و اشاعت کے مقابلہ میں بے صبر ہو کر تم ایسی باتوں پر نہ اتر آؤ جو صداقت و انصاف، وقار و تہذیب اور اخلاقِ فاضلہ کے خلاف ہوں۔

[۲] یعنی انھیں یہ تو یاد رہ گیا کہ بعض پیغمبروں کو آگ میں جلنے والی قربانی بطور نشان کے دی گئی تھی، مگر یہ یاد نہ رہا کہ اللہ نے اپنی کتاب ان کے سپرد کرتے وقت ان سے کیا عہد لیا تھا اور کس خدمتِ عظمیٰ کی ذمہ داری ان پر ڈالی تھی۔

[۳] مثلاً کہا جائے کہ حضرت بڑے متقی ہیں، دیندار و پارسا ہیں، خادمِ دین ہیں، حامیِ شرعِ متین ہیں، مُصلح و

(باقی اگلے صفحہ پر)

ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔[۱] (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے کہ جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا اُسے درحقیقت بڑی ذلت و رسوائی میں ڈال دیا اور پھر ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔[۲] مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔[۳] پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگذر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انھیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا! جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کیے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔"[۴] (جن لوگوں نے یہ دعا کی) ان کو ان کے رب کی طرف سے جواب ملا کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔[۵] لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے گھر بار چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے اور ستائے گئے اور جو میرے لیے لڑے

(بقیہ سابق) مزکّی ہیں، حالانکہ حضرت کچھ بھی نہیں۔

[۱۲۰] یہ خاتمہ کلام ہے۔ اس کا ربط اوپر کی قریبی آیات میں نہیں بلکہ پوری سورۃ میں تلاش کرنا چاہیے۔ اس کو سمجھنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ سورۃ کی تمہید کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی ان نشانیوں سے ہر شخص بآسانی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ خدا سے غافل نہ ہو، اور آثار کائنات کو جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ غور و فکر کے ساتھ مشاہدہ کرے۔

[۲] یعنی جب وہ نظام کائنات کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت ان پر کھل جاتی ہے کہ یہ سراسر ایک حکیمانہ نظام ہے، اور یہ بات سراسر حکمت کے خلاف ہے کہ جس مخلوق میں اللہ نے اخلاقی حس پیدا کی ہو، جسے تصرف کے اختیارات دیے ہوں، جسے عقل و تمیز عطا کی ہو، اس سے اس کی حیات دنیا کے اعمال پر باز پرس نہ ہو، اور اسے نیکی پر جزا اور بدی پر سزا نہ دی جائے۔ اس طرح انھیں آخرت کا یقین حاصل ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی سزا سے پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اور مارے گئے ان کے سب قصور معاف کر دوں گا اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔

دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے، پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی طرف سے یہ سامانِ ضیافت ہے ان کے لیے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہی سب سے بہتر ہے۔ اہل کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں، اُس ہدایت پر ایمان لاتے ہیں جو تمھاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس ہدایت پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی، اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں، اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔

اے ایمان لانے والو! صبر سے کام لو، باطل کے مقابلہ میں قدم مضبوط رکھو اور حق کی خدمت کے لیے کمربستہ
ع ۲۰ رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

(بقیہ سابق) اسی طرح یہی مشاہدہ اُن کو اس بات پر بھی مطمئن کر دیتا ہے کہ پیغمبر اس کائنات اور اس کے آغاز و انجام کے متعلق جو نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور زندگی کا جو راستہ بتاتے ہیں وہ سراسر حق ہے۔

یعنی انھیں اس امر میں تو شک نہیں ہے کہ اللہ اپنے وعدوں کو پورا کریگا یا نہیں، البتہ تردد اس امر میں ہے کہ آیا ان وعدوں کے مصداق ہم بھی قرار پاتے ہیں یا نہیں، اس لیے وہ اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ ان وعدوں کا مصداق ہمیں بنا دے اور ہمارے ساتھ انھیں پورا کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا میں تو ہم پیغمبروں پر ایمان لاکر کفار کی تضحیک اور طعن و تشنیع کے ہدف بنے ہی ہیں، قیامت میں بھی ان کافروں کے سامنے ہماری رسوائی ہو۔

یعنی تم سب انسان ہو اور میری نگاہ میں یکساں ہو میرے ہاں یہ دستور نہیں ہے کہ عورت و مرد، آقا اور غلام، کالے اور گورے، اونچ اور نیچ کے لیے انصاف کے اصول اور فیصلے کے معیار الگ الگ ہوں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) روایت ہے کہ بعض غیر مسلم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ موسیٰ عصا اور ید بیضا لائے تھے، عیسیٰ اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے، دوسرے پیغمبر بھی کچھ نہ کچھ معجزے لائے تھے، آپ فرمائیں کہ آپ کیا لاتے ہیں؟ اس پر آپ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں اور ان سے کہا کہ میں یہ لایا ہوں۔

مقالات

اسلام میں مرتد کا حکم

کیا حکومتِ اسلامی میں تبلیغِ کفر کی اجازت ہے؟

۲۔ دارالاسلام میں تبلیغِ کفر کا مسئلہ یہاں تک ہماری بحث پہلے سوال سے متعلق تھی یعنی یہ کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں۔ اب ہم دوسرے سوال کو لیتے ہیں جسے سائل نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"کیا ایک صحیح اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلموں کو اپنے مذاہب کی تبلیغ کا حق اسی طرح ہوگا جس طرح مسلمانوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق حاصل ہونا چاہیے؟ کیا خلافتِ راشدہ اور بعد کی خلافتوں کے تحت کفار و اہلِ کتاب کو اپنے مذاہب کی تبلیغ کا حق حاصل تھا؟"

اس مسئلہ کا فیصلہ بڑی حد تک تو قتل مرتد کے قانون نے خود ہی کر دیا ہے، کیونکہ جب ہم اپنے حدودِ اقتدار میں کسی ایسے شخص کو جو مسلمان ہو اسلام سے نکل کر کوئی دوسرا مذہب و مسلک قبول کرنے کا "حق" نہیں دیتے تو لامحالہ اس کے معنی یہی ہیں کہ ہم حدودِ دارالاسلام میں اسلام کے بالمقابل کسی دوسری دعوت کے اُٹھنے اور پھیلنے کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ دوسرے مذاہب و مسالک کو تبلیغ کا "حق" دینا، اور مسلمانوں کے لیے تبدیلِ مذہب کو جرم ٹھیرانا، دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور موخر الذکر قانون مقدم الذکر چیز کو خود بخود کالعدم کر دیتا ہے۔ لہٰذا قتل مرتد کا قانون فی نفسہ یہ نتیجہ نکالنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام اپنے حدودِ اقتدار میں تبلیغِ کفر کا روادار نہیں ہے لیکن ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ قانون صرف مسلمانوں کو تبلیغِ کفر کے اثرات سے محفوظ کرتا ہے، اس کے بعد یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ آیا اسلام اپنے حدود میں رہنے والے غیر مسلموں اور باہر سے آنے والے داعیوں کو غیر مسلم آبادی میں اپنے مذاہب و مسالک کی دعوت پھیلانے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں؟

مسئلہ کی تحقیق ۔ اس سوال کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام کی پوزیشن اور اسلامی حکومت کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

اسلام کی اصلی پوزیشن یہ ہے کہ وہ خود ایک راستہ نوعِ انسانی کے سامنے پیش کرتا ہے اور پوری قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہی میرا راستہ صحیح ہے اور دوسرے سب راستے غلط ہیں، اسی میں انسان کی فلاح ہے اور دوسرے راستوں میں انسانیت کے لیے تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا اسی راہ پر سب لوگوں کو آنا چاہیے اور دوسرے راستوں کو چھوڑ دینا چاہیے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِی مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ۔ (الانعام - ۱۹)

اور یہ کہ میرا یہ راستہ ہی ایک سیدھا راستہ ہے پس تم اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو ورنہ تم اللہ کے راستے سے ہٹ جاؤ گے۔

اُس کی نگاہ میں ہر وہ طریقِ فکر و عمل جس کی طرف کوئی غیر مسلم دعوت دیتا ہے، گمراہی ہے اور اس کی پیروی کا نتیجہ انسان کے لیے نقصان اور خالص نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ہے:

اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ (البقرہ - ۲۷)

وہ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے۔

اس دعوے اور اس دعوت میں اسلام اپنے اندر کوئی ثانی تذبذب اور تردد نہیں رکھتا۔ وہ اس شک میں مبتلا نہیں ہے کہ شاید کوئی دوسرا راستہ بھی حق اور موجبِ فلاحِ انسانیت ہو۔ اسے اپنے حق اور دوسری تمام راہوں کے باطل ہونے کا پورا یقین ہے۔ پس جب اسلام کی پوزیشن یہ ہے تو اس کی طرف سے یہ امر ایک متناقض طرزِ عمل ہوگا کہ وہ ایک طرف دوسری تمام راستوں کے باطل ہونے کا دعویٰ اس قدر یقین کے ساتھ بھی کرے اور دوسری طرف گمراہ لوگوں کے اس حق کو بھی تسلیم کرے کہ وہ بندگانِ خدا کو ان باطل راستوں کی طرف بلائیں۔ دعوت و تبلیغ کا "حق" تو بڑی چیز ہے، اس کی پوزیشن تو یہ بھی گوارا نہیں کرتی کہ وہ کسی غیر مسلم کے لیے دہریت یا کفر یا شرک پر قائم رہنے کو اس کا "حق" تسلیم کرلے۔ زیادہ سے زیادہ جس چیز کو وہ بادلِ ناخواستہ گوارا کرتا ہے وہ بس یہ ہے کہ جو شخص کفر پر قائم رہنا چاہتا ہے اسے "اختیار" ہے کہ اپنی فلاح کے راستہ کو چھوڑ کر اپنی بربادی کے راستہ پر چلتا رہے۔ اور یہ بھی وہ صرف اس لیے گوارا کرتا ہے کہ زبردستی کسی کے اندر ایمان اتار دینا قانونِ فطرت کے تحت ممکن نہیں ہے، ورنہ انسانیت کی خیر خواہی کا اقتضا یہ تھا کہ اگر کفر کے زہر سے لوگوں کو بجبر بچانا ممکن ہوتا تو ہر اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیا جاتا جو اس زہر کا پیالہ پی رہا ہے۔ اس جبری حفاظت

اور نجات دہندگی سے اسلام کا اجتناب اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ تباہی کے گڑھے کی طرف جانے کو لوگوں کا "حق" سمجھتا ہے اور انھیں روکنے اور بچانے کو "باطل" خیال کرتا ہے، بلکہ اس کار خیر سے اس کے اجتناب کی وجہ صرف یہ ہے کہ خدا نے جس قانون پر کائنات کا موجودہ نظام بنایا ہے اس کی رُو سے کوئی شخص کفر کے تباہ کن نتائج سے نہیں بچایا جا سکتا جب تک کہ وہ خود کافرانہ طرز فکر و عمل کی غلطی کا قائل و معترف ہو کر مسلمانہ رویہ اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے اس لیے اور صرف اسی لیے اسلام اللہ کے بندوں کو یہ "حق" نہیں بلکہ "اختیار" دیتا ہے کہ وہ تباہی و بربادی ہی کے راستہ پر چلنا چاہتے ہیں تو چلیں لیکن اُس سے یہ امید کرنا عبث ہے کہ وہ اس اختیار کے ساتھ ان خودکشی کرنے والوں کو یہ بھی اختیار دے گا کہ جس تباہی کی طرف وہ خود جا رہے ہیں اس کی طرف دوسرے بندگانِ خدا کو بھی چلنے کی ترغیب دیں جہاں اس کا بس نہیں چلتا وہاں تو وہ مجبور ہے، لیکن جہاں اس کی اپنی حکومت قائم ہو اور اللہ کے بندوں کی فلاح و بہبود کا ذمہ اس نے لیا ہو وہاں چوری اور ڈاکے اور قحبہ گری اور افیون نوشی اور زہر خوری کی تبلیغ کا لائسنس دینا اگر اس کے لیے ممکن نہیں ہے تو اس سے بدرجہا زیادہ مہلک چیز، کفر و شرک اور دہریت اور خدا سے بغاوت کی تبلیغ کا لائسنس دینا اس کے لیے کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے؟

اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد اسلام جس غرض کے لیے اپنی حکومت قائم کرتا ہے وہ محض انتظام ملکی نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک واضح اور متعین مقصد ہے جسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (التوبہ - ۵)	وہ اللہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔
وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال - ۵)	اور تم ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ - ۱۷)	اور اسی طرح تو ہم نے تم کو امتِ وسط (بہترین گروہ) مقرر کیا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو

ان آیات کی رو سے پیغمبر کے مشن کا اصل مدعا یہ ہے کہ جس ہدایت اور دینِ حق کو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے اسے

ہر اُس نظامِ زندگی کے مقابلہ میں غالب کر دے جو "دین" کی نوعیت رکھتا ہو، اور لامحالہ اِس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جہاں پیغمبر کو اپنے اس مشن میں کامیابی حاصل ہو جائے وہاں وہ کسی ایسی دعوت کو نہ اُٹھنے دے جو خدا کی ہدایت اور اس کے دین کے مقابلہ میں کسی دوسرے دین یا نظامِ زندگی کے غلبہ کی کوشش کرنا چاہتی ہو۔ پیغمبر کے بعد جس طرح اس کے جانشین اُس دین کے وارث ہوتے ہیں جو وہ خدا کی طرف سے لایا تھا، اسی طرح وہ اس مشن کے بھی وارث ہوتے ہیں جس پر اللہ نے اسے مامور کیا تھا۔ ان کی تمام جدوجہد کا مقصود بھی یہ قرار پاتا ہے کہ دین پورا کا پورا اللہ کے لیے مخصوص ہو۔ جہاں معاملاتِ زندگی ان کے قبضہ و اختیار میں آجائیں اور جس ملک یا جس سرزمین کے انتظام کے متعلق انھیں پوری طرح خدا کے سامنے ذمہ داری کی گواہی دینی ہو، وہاں ان کے لیے یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی حفاظت و نگرانی میں خدا کے دین کے بالمقابل کسی دوسرے دین کی دعوت کو پھیلنے کا موقع دیں تاکہ دین پورا کا پورا اللہ کے لیے نہ ہونے پائے اور کسی غلط نظامِ زندگی کا فتنہ اگر باقی ہے تو وہ اور زیادہ بڑھے۔ آخر وہ خدا کے سامنے گواہی کس چیز کی دیں گے؟ کیا اس چیز کی کہ جہاں تو نے ہمیں حکمرانی کی طاقت بخشی تھی وہاں ہم تیرے دین کے مقابلہ میں ایک فتنے کو سر اٹھانے کا موقع دے آئے ہیں؟

دارالاسلام میں ذمیوں اور مستامنوں کی حیثیت

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو اپنے دین پر قائم رہنے کی جو آزادی بخشی گئی ہے اور جزیہ کے معاوضہ میں ان کی جان و مال اور ان کی مذہبی زندگی کے تحفظ کا جو ذمہ لیا گیا ہے اس کا مآل زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہے کہ جس طریقہ پر وہ خود چلنا چاہتے ہیں اس پر چلتے رہیں۔ اس سے تجاوز کر کے اگر وہ اپنے طریقہ کو دنیا میں چلانے کی کوشش کریں گے تو کوئی اسلامی حکومت جو اس نام سے موسوم کیے جانے کے قابل ہو، انھیں اس کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی۔ جزیہ کا قانون قرآن مجید کی جس آیت میں بیان ہوا ہے اس کے صاف الفاظ یہ ہیں حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ (یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں) اس آیت کی رُو سے ذمیوں کی صحیح پوزیشن اسلامی حکومت میں یہ ہے کہ وہ صاغرون بنے رہنے پر راضی ہوں۔ کابرون بننے کی کوشش وہ ذمی ہوتے ہوئے نہیں کر سکتے۔ اسی طرح باہر سے آنے والے غیر مسلم جو مستامن کی حیثیت سے دارالاسلام میں داخل ہوں، تجارت، صنعت و حرفت، سیاحت، حصولِ تعلیم، اور دوسرے تمام تمدنی مقاصد کے لیے آ سکتے ہیں، لیکن اس غرض کے لیے ہرگز نہیں آ سکتے کہ اللہ کے کلمہ کے مقابلہ میں

کوئی دوسرا کلمہ بلند کریں۔ اللہ نے کفار کے خلاف جو مدد اپنے پیغمبر کو اور اس کے بعد مسلمانوں کو دی یا آئندہ دیگا، اور جس کے نتیجہ میں دار الاسلام پہلے قائم ہوا یا آئندہ کبھی قائم ہوگا، اس کی غرض صرف یہ تھی اور آئندہ بھی یہی ہوگی کہ کافروں کا بول نیچا ہو اور اللہ کا بول بالا ہو کر رہے، فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا پس مسلمان سخت احسان فراموش اور کافر نعمت ہوں گے اگر اللہ کی اس مدد سے فائدہ اٹھانے کے بعد وہ اپنے حدودِ اختیار میں کلمۃ الذین کفرو کو سُفلی سے پھر عُلیا ہونے کے لیے کوشش کرنے دیں۔

دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کا طرزِ عمل | نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں حکومت کی مستقل پالیسی یہی تھی جو اوپر بیان ہوئی عرب میں مسیلمہ، اسود عنسی، طلیحہ اسدی، سجاح، لقیط بن مالک ازدی اور ان کے سوا جو بھی اسلام کے مقابلہ پر کوئی دعوت لیکر اٹھا اُسے زور سے دبا دیا گیا۔ جن غیر مسلم قوموں نے جزیہ پر معاہدہ کر کے اسلامی حکومت میں ذمی بن کر رہنا قبول کیا ان میں سے اکثر کے معاہدے لفظ بلفظ حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں، ان میں تمام حقوق و مراعات کی تفصیل پائی جاتی ہے مگر اس "حق" کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ وہ اپنے دین کی دعوت حدودِ دار الاسلام میں پھیلا سکیں گی۔ جن غیر مسلموں کو مسلمانوں نے خود اپنی فیاضی سے ذمیت کے حقوق عطا کیے، ان کے حقوق کی تفصیل بھی فقہ کی کتابوں میں موجود ہے مگر اس نام نہاد "حق" کے ذکر سے وہ بھی خالی ہیں۔ مستامن بن کر باہر سے آنے والے غیر مسلموں کے ساتھ حکومت اسلامی کا معاملہ جیسا کچھ بھی ہونا چاہیے اس کو فقہاء نے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس میں بھی کہیں کوئی اشارہ تک ایسا نہیں ملتا کہ اسلامی حکومت کسی ایسے شخص کو آکر اپنے حدود میں کام کرنے کی اجازت دے سکتی ہے جو کسی دوسرے مذہب و مسلک کا پرچار کرنا چاہتا ہو۔ اب اگر بعد کے دنیا پرست "خلفاء" اور بادشاہوں نے اس کے خلاف کوئی عمل کیا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اسلام کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ وہ دراصل اس کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ایک حقیقی اسلامی حکومت کے فرائض سے ناواقف یا ان سے منحرف ہو چکے تھے۔ "رواداری" کے موجودہ تصور کو جن لوگوں نے معیارِ حق سمجھ رکھا ہے وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنے بادشاہوں کے یہ کارنامے داد طلبی کے لیے غیر مسلموں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں کہ فلاں مسلمان بادشاہ نے غیر مسلم معبدوں اور مدرسوں کے لیے اتنی جائدادیں وقف کیں، اور فلاں کے دور میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنے اپنے دین کے پرچار کی پوری آزادی حاصل تھی۔ مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سب کارنامے ان بادشاہوں کے جرائم کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

(باقی)

مسلمانوں کی موجودہ قومی سیرت کے بعض کمزور پہلو

(از جناب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی)

مسلمانوں پر تنقید کرنا اور ان کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کرنا کسی مسلمان کے لیے قطعاً کوئی خوش گوار کام نہیں ہے اور اس کے لیے کوئی شخص آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا، لیکن دنیا کے سب ضروری کام خوشگوار نہیں ہوتے۔ ایک ایسی جماعت کی کمزوریوں کو خاموشی سے دیکھتے رہنا جس سے نہ صرف اس کی اپنی قسمت بلکہ دنیا کی قسمت بھی وابستہ ہے اور جو انجیل کی زبان میں زمین کا نمک ہے جس کی نمکینی کے ضائع ہو جانے کے بعد پھر زمین کو کوئی چیز نمکین نہیں کر سکتی، ایک ایسا ناخوش گوار کام ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر ناگواری، ہر تلخی، ہر طرح کی روحانی اذیت اور ہر قسم کی ذہنی کوفت ہیچ ہے، اور اس کے مقابلہ میں اپنی یا دوسروں کی یہ ناخوش گواری کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

مسلمانوں کی کسی قوم یا ملک کا سلطنت و اقتدار سے محروم ہو جانا، یا مسلمانوں کا عالمگیر سیاسی زوال بہت بڑا حادثہ ہے جس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ اس کے جو اخلاقی اور ذہنی نتائج ہوتے ہیں، وہ بھی اب کچھ پوشیدہ نہیں رہے۔ لیکن اس سے بدرجہا المناک حادثہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی ذہنیت یا نفسیت کسی ایسے سانچہ میں ڈھلنے لگے جو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت کا سانچہ نہیں ہے، اور بعض انفرادی عیوب و نقائص یا منکرِ خدا اور منکرِ آخرت قوموں کے صفات و خصائص مسلمانوں کی سیرت کا جزء بننے لگیں اور قومی کیرکٹر کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ تحریفِ دین کی اصطلاح تو پہلے سے موجود ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عملی کوتاہیوں اور ذاتی انحراف سے بڑھ کر کوئی جماعت اصلِ دین، اس کی کتابوں اور اس کی تعلیمات میں ترمیم و تنسیخ اور ردوبدل شروع کر دے۔ اس کے نتائج انحراف سے کہیں بڑھ کر خطرناک اور وسیع ہوتے ہیں، اور اس کا علاج اور اس صورتِ حال کی اصلاح تقریباً محال ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس

تحریف سے اس قوم کے ذہن میں حقائق بدل جاتے ہیں، گناہ عین صواب اور بعض اوقات کارِ ثواب بن جاتا ہے اور ان کو دین کی اصل وحقیقت سے ہٹ جانے یا دور پڑ جانے کا احساس ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں وہی عین دین معلوم ہوتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں مذہبی طور پر یہی صورت پیش آئی ہے۔ میں اس تحریفِ دین کے مقابلہ میں اس ذہنی واخلاقی تبدیلی کو جو ہندوستان کے مسلمانوں میں نظر آرہی ہے تحریفِ مسلمین سے تعبیر کروں گا۔ مسلمانوں میں عملی کوتاہیاں کم وبیش ہمیشہ پائی گئیں اور انسانوں کی کسی جماعت کا ان سے یکسر پاک ہونا بہت مستبعد ہے۔ لیکن یہ انحراف تھا، مسلمان اس کو غلط سمجھتے رہے اور اسلامی ذہن وضمیر ہمیشہ اس کے خلاف احتجاج کرتا رہا، اور کبھی مسلمانوں نے اس پر فخر نہیں کیا۔ لیکن اب جو کچھ نظر آرہا ہے اس کو انحراف کہنا مشکل ہے، وہ اس سے کچھ زیادہ وسیع اور عمیق اور اس سے مختلف شکل رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے تمام سیاسی تعلیمی اور اقتصادی مسائل سے زیادہ اہم اور قابلِ توجہ ہے۔ قومی کیرکٹر ہر قوم کی زندگی میں اس کی مادی دولتوں سے کہیں بڑھ کر بیش قیمت ہوتا ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کی اسلامی سیرت، بڑی سے بڑی اسلامی سلطنت اور بڑے سے بڑے قومی ادارہ اور زیادہ سے زیادہ قومی ترقی اور اقتصادی خوش حالی سے زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی قیمت اور عظیم سے عظیم بدل پر بھی اس کے نقصان یا زوال کو گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس پر زوال آگیا یا اس میں کچھ غلط تبدیلی واقع ہوگئی تو بڑی سے بڑی مادی کامیابی اور فتح سے اس کا کفارہ نہیں ہوسکتا۔ یہ تبدیلی مختلف تاریخی وسیاسی وتعلیمی وتہذیبی اسباب، بعض موثر اور اشتعال انگیز حالات وواقعات اور زیادہ تر قیاسات کی کمزوری سے صدیوں میں پیش آتی ہے۔ لیکن جب بدقسمتی سے یہ تبدیلی واقع ہو جاتی ہے تو صدیوں تک اس کا اثر قائم رہتا ہے اور اس کے اخلاقی واجتماعی نتائج اس قوم کے تمام افراد کو برداشت کرنے پڑتے ہیں خواہ انفرادی طور پر بعض افراد کتنے ہی نیک سیرت ہوں۔

اس موقع پر چند نمایاں کمزور پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے جو دینی واخلاقی حیثیت سے زیادہ اہمیت

رکھتے ہیں اور جن کو اصل اسلامی سیرت اور اخلاقی تعلیمات سے زیادہ بُعد اور تعارض ہے۔

(۱) ایک نہایت اہم اور گہری اور انقلاب انگیز تبدیلی جو مسلمانوں کی ذہنیت و نفسیات میں اس پچاس سال کے اندر اندر واقع ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ آخرت پر ایمان عملاً کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، اور اس کے نتیجے کے طور پر یا مستقلاً اصول اور صداقت کے مقابلہ میں منافع و مصالح، آجل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے مسلمان ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ایک بے اصول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آتے جا رہے ہیں جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہے بلکہ صرف منافع و مصالح اور اغراض و مقاصد ہیں۔ یہ تبدیلی اُس وقت شروع ہوئی جب ہندوستان میں اور تقریباً تمام اسلامی ممالک میں (جو کسی طرح یورپ کے زیرِ اثر آئے) مسلمانوں کو مغربی تہذیب، مغربی فلسفۂ اخلاق اور مغربی معیاروں کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ مغربی اخلاق، فلسفہ، علوم اور سیاست کا ہر طالب علم اور اس زمانہ کا ہر واقف آدمی جانتا ہے کہ یورپ کا سارا نظامِ زندگی تمام تر مادہ پرستی اور مصلحت جوئی پر مبنی ہے۔ "افادیت" اور "مصلحت بینی" اس نظامِ زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی ہے۔ سارا یورپ اُس وقت سے جب سے اس نے کلیسا کے اقتدار سے اپنے کو آزاد کرایا صرف ایک ہی عملی مذہب رکھتا ہے (جس کے خلاف کسی گوشہ میں بھی عملاً کوئی بغاوت نہیں) اور وہ مذہب مادہ پرستی ہے۔ مسلم ممالک میں اس نظام کے غلبہ کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ آخرت کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بعض حلقوں (میں جہاں یہ نظام اپنی پوری روح کے ساتھ مستولی ہے) معدوم ہو گئی ہے۔ دنیاوی ترقی اور مادی فوائد و منافع منتہائے نظر بن گئے ہیں، اصولی و اخلاقی معیار منافع و فوائد کے مقابلہ میں اپنی اہمیت بالکل کھو چکے ہیں۔ مسلمانوں میں اس دعوت کے علمبرداروں نے ترقی (یعنی دنیاوی ترقی) پر اتنا زور دیا اور اس شد و مد اور بلند آہنگی سے مادی ترقی کی دعوت دی کہ بالارادہ یا بلا ارادہ آخرت اور امورِ آخرت کی اہمیت کم ہو گئی، بلکہ بعض اوقات انھوں نے اس نظام اور ان افکار کی تضحیک و تنقیص

کی جس میں دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی اہمیت زیادہ تسلیم کی گئی تھی اور مسلمانوں کو دنیا پرست اور آخرت سے غافل ہونے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اُن جملوں اور اُن تقریروں اور تحریروں کا مذاق اُڑایا گیا اور ان کی ہجو کی گئی جن میں دنیا کو متاعِ قلیل اور متاعِ غرور کہا گیا تھا۔ دنیا پرست ، مادہ پرست اور منکرِ آخرت قوموں اور ملکوں (غالباً صحیح تر ایک قوم اور ملک) کو مسلمان نوجوانوں کے سامنے ایک بلند نمونہ اور معیارِ کامل کے طور پر پیش کیا گیا جو ہر تنقید سے بالاتر تھا۔ پھر جو نظامِ تعلیم قائم کیا گیا اس میں انکارِ آخرت کی روح لبی ہوئی تھی، اس کی اساس اخلاق کے مقابلہ میں ظاہری منافع کی ترجیح پر رکھی گئی تھی، اس میں شرافت اور اخلاق کے مقابلہ میں خواہشِ نفس اور لذت کا عنصر غالب تھا، وہ تمام تر ایسی قوم اور ایسی تہذیب کے ذہن کی پیداوار تھا جو سرتاپا منکرِ آخرت تھی۔ دراصل یہ کسی مجرد نظامِ تعلیم کی قبولیت کی دعوت نہ تھی اور نہ ایسا ممکن ہے بلکہ یہ ایک پوری تہذیب، تمدن و معاشرت اور اخلاق و فلسفۂ اجتماع کی دعوت تھی۔

پھر اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ انھوں نے مسلمانوں کو صاف صاف ہوا کے رُخ پر چلنے اور دریا کے بہتے ہوئے دھارے پر کشتی چھوڑ دینے کی دعوت دی اور صاف صاف کہا کہ

"چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"

اور ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"

اس دعوت و تبلیغ میں مسلمانوں کی بہترین قابلیتیں صرف ہوئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نظروں میں اصول و اخلاق کی اہمیت بتدریج گھٹتی چلی گئی اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس کے نزدیک اخلاق و مصالح میں کوئی تقابل نہ تھا اور ہر موقع پر مصالح کو اصول پر ترجیح حاصل تھی۔ وہ ہر وقت بڑے سے بڑے مذہبی اصول، شرعی حکم اور اخلاقی تعلیم کو ایک شخصی منفعت یا قومی مصلحت پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خاص قسم کی محدود معاشی ترقی کے ساتھ ایک عام اخلاقی انحطاط اور بے اصولی پھیل گئی۔ بیسویں صدی کے اس نصفِ اول میں ہندوستان میں ہمیں مسلمانوں کے کیرکٹر میں

پہلے کے مقابلہ میں نمایاں اور محسوس انحطاط نظر آرہا ہے، جو ہر سوچنے سمجھنے والے مسلمان کے لیے حد درجہ تشویش ناک ہے۔ اب ایک اصول اور مذہبی اعتقاد کے مقابلہ میں ذاتی ترقی یا شخصی فوائد کی قربانی کی مثالیں کم سے کم تر نظر آتی ہیں اور وہ بھی زمانہ گذشتہ کی یادگاریں ہیں جو برابر روبزوال ہیں۔ اب تمام مسائل زندگی پر ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا طریق فکر اور زاویۂ نگاہ خالص مادہ پرستانہ اور تاجرانہ ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کام میں اس کے لیے کتنی مالی منفعت ہے یا اس کو کس قدر جاہ و اعزاز حاصل ہوگا اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ وہ شرعاً اس کے لیے جائز اور اخلاقاً مستحسن ہے یا نہیں بلکہ اس کا اپنا ضمیر بھی اس سے مطمئن ہے یا نہیں۔ یہ سوالات مسلمانوں کے دماغوں سے ایک عرصہ سے بالکل نکلتے جارہے ہیں یا ان کی اہمیت کم ہوگئی ہے اور ان کی بنا پر کسی مسلمان کو کسی عہدہ یا منفعت یا اعزاز کے قبول کرنے میں قلب وضمیر کی رکاوٹ کم سے کم پیش آتی ہے خواہ وہ شریعت میں مطلقاً حرام اور اخلاقاً حد درجہ معیوب ہو اور اس کا ضمیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے مطمئن نہ ہو۔ بلکہ اب اس کو ایک قومی خدمت سمجھا جاتا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کو دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ جو روپیہ کسی جائز یا ناجائز طریقہ پر کسی فرد کی جیب میں آتا ہے اور اس کے بچوں اور متعلقین کی خوش حالی کا سبب بنتا ہے وہ گویا قومی فنڈ میں جمع ہوتا ہے اس لیے کہ یہ سب مسلمان ہیں اور ایک مسلمان کی خوش حالی یا چند افراد کی خوش حالی خواہ وہ کسی قدر ذلت اور احکام مذہب کی صریح مخالفت کے بعد ہی ہو قومی خوش حالی کے مرادف ہے۔

اس ذہنیت وسیرت اور اس عام اخلاقی انحطاط اور کیرکٹر کی کمزوری کا اثر مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر پڑ رہا ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا عیب نظر نہیں آتا، بلکہ اس پر بحث کی گنجائش بھی بہت کم رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ وہ عام بے اصولی، تناقض اور اخلاقی کمزوریاں ہیں جن کی مثالیں ہمیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ ہمارے مسلمان اخبار و رسائل میں (الا ماشاء اللہ) ہر قسم کا خلاف تہذیب اشتہار شائع کرایا جاسکتا ہے اگر اس کی قیمت ادا کردی جائے۔ ادبی رسائل میں ہر قسم کے مخرب اخلاق،

حیا سوز و عریاں مضمون، افسانے، اشعار شائع ہو سکتے ہیں، بے حیائی اور اخلاقی بے نظمی کی ہر تحریک کے لیے وہ آلہ بن سکتے ہیں، بد تر سے بد تر فواحش کی اشاعت ان کے ذریعہ سے کی جا سکتی ہے اگر ان کو اس راستہ سے اپنے رسالہ کی کامیابی اور مقبولیت کا ایک فی صدی بھی امکان نظر آئے تو ایسی صورت میں وہ اس کی ہر گز پروانہ کریں گے کہ ان کی اس حرکت سے خلقِ خدا کی اخلاقی ابتری اور انحطاط کا ۹۹ فی صدی امکان ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان اخبارات و رسائل کے مالک و ایڈیٹر ذاتی طور پر شریف مسلمان ہوں، اور وہ اصولاً ان چیزوں کو اچھا نہ سمجھتے ہوں لیکن اگر آپ اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو کریں گے تو وہ صاف کہدیں گے کہ تجارت و صحافت میں اصول، مذہب اور اخلاق کی پابندی نہیں کی جا سکتی۔

اخبارات کسی اصول اور صحیح مسلک کی ترجمانی اور صحیح خیالات و افکار کی اشاعت کے بجائے اپنے قارئین اور عوام کے خیالات و خواہشات کی ترجمانی کو اصولِ صحافت سمجھتے ہیں۔ وہ عوام کی ناراضی اور بددلی کو ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ان کی خوشی اور اپنے اخبارات کی مقبولیت و اشاعت کے لیے ہر قسم کی بے اصولی، ہر طرح کے تناقض اور ہر درجہ کے ابتذال کو گوارا کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے مذاقِ سلیم، فکرِ صحیح اور اخلاقِ قومی پر یہ اخبارات بڑی طاقت کے ساتھ اثرانداز ہیں اور مسلمانوں کے افکار و خیالات میں جو عام بے ربطی و تناقض، عام ذہنی انتشار اور اشتعال پذیری پائی جاتی ہے اس میں میرے نزدیک ان اخبارات کا بڑا حصہ ہے۔

مسلمان اہلِ علم اور اہلِ قلم کو آپ ہر کام پر لگا سکتے ہیں اگر اس کا خاطر خواہ معاوضہ آپ ان کو ادا کریں۔ ان سے خود ان کے خیالات و افکار کے خلاف سب کچھ کہلوا سکتے ہیں، لکھوا سکتے ہیں اور شائع کروا سکتے ہیں اگر اس کی قیمت ادا کر سکیں۔ بڑے بڑے سنجیدہ اور ذی علم اہلِ قلم و اخبار نویس اور پُرجوش اسلامی نظمیں لکھنے والے شاعروں سے ایسے پروپیگنڈے کا کام لیا جا سکتا ہے جس سے وہ خود بھی متفق نہیں ہیں۔ اگر آپ اُن سے اس بارہ میں استفسار کریں گے تو وہ آپ کو جواب دیں گے کہ "اس میں کونسا ہی

یا قومی نقصان یا شرعی گناہ ہے؟ یہ تو ایک "بزنس" ہے۔ ایک شخص ہم کو معاوضہ دیتا ہے اور ہم اس کے بدلے میں اسے ایک تقریر یا مضمون تیار کر دیتے ہیں۔ گویا ضمیر فروشی بھی ایک شریفانہ تجارت ہے اور تعاون علی الاثم والعدوان (گناہ اور زیادتی پر مدد کرنا) خود کوئی گناہ نہیں۔ حالانکہ یہ دماغی و ذہنی بیسوائی اُس بیسوا عورت کے گناہ سے بدتر ہے جو اپنا جسم کرایہ پر چلاتی ہے۔

جب سے مسلمانوں پر مغربی طرز کی قومیت کا غلبہ ہوا ہے وہ ہر چیز کو قومی ترقی اور قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ اور جن چیزوں کا ارتکاب وہ ذاتی سربلندی اور شخصی منفعت کے لیے کرتے تھے اب اس کو قومی مفاد کے لیے ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ مثلاً اب اُن کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ تمام محکموں اور شعبوں میں ان کا تناسب قائم رہے خواہ وہ آبکاری کا محکمہ ہو یا جاسوسی کا، سودی کاروبار کے نظام ہوں یا فی سبیل الشیطان لڑنے والے نظام۔ غضب یہ ہے کہ وہ کام بھی جس کی حرمت مسلمانوں کے لیے قرآن کی نصِ قطعی سے ثابت ہے اور جس پر قرآن کی یہ دو آیتیں شاہد ہیں؛

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔ (النسار)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (النسار)

اس کو اسی قومی مفاد اور مسلمانوں کے تناسب اور ان کے قومی تفوق کو برقرار رکھنے کے لیے جائز قرار دیا گیا اور بعض مسلمانوں ہی کی کوشش سے اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

ان تمام مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک اصول و صداقت پر مفاد و مصالح مقدم ہیں۔ اخلاقی معیار اور اخلاقی حقیقتیں ان کی نگاہ میں وقیع نہیں۔

اصل چیز وہ منافع اور فوائد ہیں جن کا حصول اپنی ذات، خاندان، یا قوم کے لیے ضروری یا فائدہ مند سمجھا جاتا ہے یہ ذہنی کیفیت اور سیرت ایک ایسی ملت کے لیے جو پیغمبروں کی تعلیمات اور اصول کی حامل و امین ہے اور اصول و اخلاق، سیرت و کردار میں تمام دنیا کے لیے نمونہ و شاہد ہے (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ) حد درجہ نامناسب اور غیر مطابق ہے اگرچہ ایک خالص "قوم" کے لیے بالکل مناسب اور عین مطابق ہے، اور اس کا مسلمانوں کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟

یہ ذہنیت و سیرت ہمارے علم میں کم سے کم ہندوستان میں اس پچیس تیس برس کے عرصہ میں نمایاں ہوئی ہے اور اس کو بڑا فروغ اس مغربی قوم پرستی اور موجودہ سیاسی جوش اور دفاعی جذبہ نے دیا ہے جو ان پچھلے برسوں میں مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انھوں نے اصول و اخلاق پر بڑے بڑے مصالح و منافع کو ہمیشہ قربان کیا اور ایک اخلاقی اصول یا دینی حکم کی حفاظت کے لیے انھوں نے عظیم الشان سیاسی و معاشی فوائد کو ٹھکرا دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ کے معاملہ میں ٹھیک یہی طرز عمل اختیار کیا تھا جسے ایک خالص قوم پرست کے نقطۂ نظر سے ایک بڑی سیاسی غلطی کہنا چاہیے۔ صرف ایک شرعی حکم (قصاص) اور ایک دینی اصول (مساوات) کے قائم رکھنے کی خاطر ان کو جبلہ جیسے بااثر والی ریاست اور غسان جیسے طاقتور قبیلہ کی امداد سے دستبردار ہونا پڑا مگر انھوں نے اس کے لیے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جبلہ سے ہزار درجہ بڑھ کر طاقتور فرماں روا اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے، غسان سے ہزار درجہ بڑی ریاستیں اسلام کے اثر میں آئیں اور شریعت اسلامی میں کوئی تحریف نہیں ہو سکی،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی سیاسی مصلحت کی خاطر ادنیٰ درجہ کی بھی بے اصولی اور اخلاقی معیار سے انحراف قبول نہیں کیا اور اس کے لیے وہ تمام مشکلات قبول کیں جو ان کو اپنی خلافت میں پیش آئیں

مگر نظامِ خلافت میں انھوں نے کوئی تحریف نہیں ہونے دی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوئی سیاسی مصلحت اور قومی مفاد ایک ایسے نظامِ حکومت سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ کر سکا جو ان کے نزدیک غلط اور ان کے اعتقاد و اصول کے خلاف تھا۔

ابھی نصف صدی پہلے جب مغربی تہذیب اور مغربی افکار ہندوستان میں مقبول نہیں ہوئے تھے ہندوستانی مسلمانوں کا کیرکٹر اتنا مضبوط تھا کہ اعلیٰ قسم کے دینداروں کے علاوہ متوسط درجہ کے با اصول اور وضعدار شرفا بھی جھوٹ بولنا، اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف کوئی کام کرنا یا کچھ کہنا کفر سے کم نہیں سمجھتے تھے اور مرجانے کو اس پر ترجیح دیتے تھے۔ بدایوں کے ایک بزرگ (غالباً مولوی رضی الدین صاحب) ۵۷ء کے ہنگامہ میں ماخوذ تھے۔ کلکٹر یا جج ان کا شاگرد تھا۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ مولوی صاحب ایک مرتبہ اپنی زبان سے جرم کا انکار کر دیں تو وہ ان کو صاف بری کر دے گا۔ لیکن انھوں نے آخر وقت تک جھوٹ بولنے اور اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف کچھ کہنے سے انکار کیا اور سزائے موت قبول کی۔

مولانا محبوب علی صاحب دہلوی نے ہندوستان کی مشہور تحریکِ جہاد (حضرت سید احمد شہید و مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریک) میں کچھ اختلاف کیا، بعد میں انگریزوں نے ۹ گاؤں صلہ میں دینے چاہے مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ میرا اجتہاد تھا۔ میں نے کسی مصلحت سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

یہ سینکڑوں ہزاروں میں سے دو مثالیں تھیں۔ شریف خاندانوں اور شرفا کی بستیوں میں جا کر پوچھیے تو اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ سنیں گے۔

سیرت کی صلابت، اخلاق کی استقامت اور اصول کی پابندی کی ان مثالوں کا مقابلہ اس زمانہ کی بے اصولیوں اور اخلاقی کمزوریوں، ضمیر فروشیوں اور مسلک و خیالات کی نیرنگیوں سے کیجیے، تو آپ کو اس عام قومی انحطاط اور اخلاقی زوال کا اندازہ ہوگا جو مسلمان قوم میں نظر آرہا ہے اور روز بروز سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا وہ تاریک پہلو ہے جس کو دیکھ کر ایک حساس مسلمان کا

دل خون ہوتا ہے اور وہ اس تلخ نوائی پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس کے لیے اور پڑھنے والوں کے لیے کوئی خوش گوار چیز نہیں۔

اخلاق وسیرت اس امت کے نظام جسم میں قلب کا درجہ رکھتے ہیں۔ لوگ تنومند و فربہ جسم کو دیکھکر اس جسم کی صحت وطاقت کا حکم لگا دیتے ہیں، اور یہ نہیں دیکھتے کہ قلب کس قدر کمزور اور ماؤف ہے اور کس طرح بتدریج اس کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ مردم شماری کے اعداد ان کے قومی جوش، ظاہری تنظیم اور سرکاری عہدوں کے تناسب سے لگانا بالکل غلط ہے۔ ایک بااصول دنیا کے لیے ایک پیغام رکھنے والی، اور اخلاق وسیرت میں دنیا کی تمام قوموں کے لیے معیار بننے والی امت کی پیمائش کا ہر گز یہ صحیح پیمانہ نہیں۔ ضرورت ہے کہ دیکھا جائے کہ وہ اخلاق واوصاف جو زندگی کے صحیح عناصر ہیں، اور جن سے اس امت کا تشخص وامتیاز ہے وہ روبانحطاط ہیں یا روبترقی۔ اور اس کا اندازہ سرکاری کاغذات سے نہیں ہو سکتا، بلکہ مسلمانوں کی عام زندگی اور ان کے اقوال وافعال سے ہو سکتا ہے۔ بقول اکبر مرحوم:

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

(باقی)

جبر و قدر

(ایک تقریر جو ۲۳ اکتوبر ۴۲ء کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی)

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

کیا ہماری تقدیر پہلے سے مقرر ہے؟ کیا ہماری کامیابی اور ناکامی، ہمارا گرنا اور ابھرنا، ہمارا بگڑنا اور سدھرنا، ہماری راحت اور تکلیف اور وہ سب کچھ جو ہمارے ساتھ اس دنیا میں پیش آتا ہے کسی اور کی طاقت یا طاقتوں کے فیصلہ کا نتیجہ ہے جس کے متعین کرنے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں؟ اور اگر ایسا ہے تو کیا ہم بالکل مجبور ہیں؟ کیا ہم اس دنیا میں محض کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں جنہیں کوئی اور نچا رہا ہے؟ کیا ہم کسی بنی بنائی سکیم کو عمل میں لانے کے لیے بس ایک آلہ کے طور پر استعمال کیے جا رہے ہیں گویا کہ ہم دنیا کے اسٹیج پر ان ایکٹروں کی طرح ہیں جن میں سے ہر ایک کا کام پہلے سے کسی نے مقرر کر دیا ہو؟

یہ سوالات ہمیشہ سے ہر اس شخص کے دل میں کھٹکتے رہے ہیں جس نے کبھی دنیا اور انسان کے متعلق کچھ غور کیا ہے۔ فلسفی، سائنس داں، مؤرخ، مقنن، سماج اور اخلاق اور مذہب کے مسائل سے بحث کرنے والے، اور عام لوگ، سبھی کو اس گتھی سے اپنا دماغ لڑانا پڑا ہے کیونکہ ہر ایک کی گاڑی یہاں آکر اٹک جاتی ہے اور آگے نہیں چلتی جب تک کہ اس کا کوئی نہ کوئی قابلِ اطمینان حل نہ مل جائے، چاہے وہ بجائے خود صحیح حل ہو یا غلط۔

محض ایک سادہ سی "ہاں" یا "نہیں" میں آپ ان سوالات کا جواب دینا چاہیں تو دے لیجیے، ممکن ہے کہ اس جواب سے آپ کا دل مطمئن ہو جائے، مگر خواہ آپ "ہاں" کہیں یا "نہیں"، دونوں صورتوں میں بے شمار دوسرے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کا جواب دینا آپ کی ہاں اور نہیں دونوں کے بس کا کام نہیں ہے۔

آپ "ہاں" کہتے ہیں، تو پھر ساتھ ہی آپ کو یہ بھی مان لینا چاہیے کہ پتھر، لوہے، درخت، جانور اور انسان میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے۔ سب کی طرح انسان بھی وہی کچھ کر رہا ہے جو اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اختیا

نہ اُن کو حاصل ہے نہ اِس کو۔ شہد کی مکھی کا چھتہ بنانا اور انسان کا ریلوے لائن تیار کرنا، دونوں میں چاہے درجہ کا فرق ہو مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں کیونکہ اُس سے چھتہ اور اِس سے ریلوے لائن کوئی اور ہی بنوا رہا ہے۔ ایجاد کے شرف سے دونوں محروم ہیں۔ اِس کے بعد آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح انسان بھی اپنے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے۔ ایک آدمی کا نیک کام کرنا اور ایک موٹر کا درست چلنا، دونوں یکساں ہیں۔ کسی آدمی کا جرم یا شرارت کرنا اور کسی سینے والی مشین کا خراب بخیہ کرنا دونوں کی ایک حیثیت ہے۔ اور جب معاملہ یہ ہے تو جس طرح آپ "نیک موٹر"، "شریر مشین"، "ایماندار انجن"، "بدمعاش چرخہ" نہیں بولتے اسی طرح آپ کو آدمی کے لیے بھی نیک اور بد، شریر اور شریف، ایماندار اور بے ایمان، اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ نہیں بولنے چاہییں۔ یا اگر آپ بولتے ہی ہیں (کیونکہ جو کچھ آپ سے بلوایا جا رہا ہے وہ بولنے پر آپ مجبور ہیں) تو کم از کم اتنا تو سمجھ ہی لینا چاہیے کہ یہ الفاظ ہیں بے معنی۔ پھر بات اسی پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ ہمارا مذہب اور اخلاق، یہ ہمارا قانون اور عدالتوں کا نظام، یہ ہماری پولیس اور جیل اور تفتیش جرائم کے محکمے، یہ ہمارے مدرسے اور تربیت گاہیں اور اصلاحی ادارے، سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ کام یہ سب ہوتے رہیں گے، بند ان میں سے کوئی بھی نہ ہوگا، کیونکہ آپ کے نظریہ کے مطابق اِن سب ایکٹروں کو دنیا کے اسٹیج پر اپنا اپنا مقررہ پارٹ ادا کرنا ہی ہے، مگر ظاہر ہے کہ جب مسجدوں کے نمازی اور مندروں کے پجاری، عدالتوں کے جج اور چوری اور ڈکیتی کے مجرم سب کے سب محض ایکٹر بن کر رہ جائیں اور عبادت گاہوں سے لے کر جوئے خانوں اور قید خانوں تک سب کے سب ایک بڑے ناٹک کے مختلف منظر قرار پائیں تو اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان کی پوری مذہبی و اخلاقی زندگی محض ایک کھیل اور تماشا ہے۔ وہ شخص جو رات کی تنہائی میں نہایت خلوص سے پوجا اور عبادت کر رہا ہے، اور وہ جو کسی کے گھر میں نقب لگا رہا ہے، دونوں اس تماشے میں بس وہ پارٹ ادا کر رہے ہیں جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے، ان کے درمیان کوئی فرق اس کے سوا نہیں کہ ڈائرکٹر نے ایک کو عابد و زاہد کا پارٹ دیا ہے اور دوسرے کو چور کا۔ ہماری عدالت میں جج صاحب خواہ کتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ مقدمہ کی سماعت فرما رہے ہوں اور اپنی دانست میں مقدمہ کو سمجھ کر انصاف کرنے کی

کیسی ہی کوشش کر رہے ہوں، مگر آپ کے اس نظریہ کی رو سے وہ اور مستغیث اور ملزم سب کے سب ایکٹر ہیں اور بیچارے اس دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ کر رہے ہیں ڈراما اور سمجھ رہے ہیں کہ عدالت کے کمرے میں واقعی عدالت ہو رہی ہے۔ یہ انجام ہے اُس "ہاں" کا جو آپ نے شاید سرسری طور پر میرے ابتدائی سوالات کے جواب میں کر دی تھی۔

اچھا، تو کیا پھر آپ ان سوالات کا جواب "نہیں" کی صورت میں دیں گے؟ مگر مشکل یہ ہے کہ اس صورت میں بھی معاملہ ایک "نہیں" پر ختم نہ ہو جائے گا بلکہ اس کے ساتھ آپ کو بہت سی صریح حقیقتوں کا انکار کرنا ہوگا۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ انسان کی تقدیر پہلے سے مقرر نہیں ہے اور یہ کہ اس کی تقدیر کسی بیرونی قوت کے فیصلے سے نہیں بنتی تو غالباً آپ کے اس انکار کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی تقدیر آپ مقرر کرتا ہے یعنی اس کی تقدیر اس کے اپنے ارادے اور کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس پر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے اس بیان میں لفظ "انسان" سے کیا مراد ہے؟ فرداً فرداً ایک ایک آدمی؟ یا انسانوں کا ایک بڑا گروہ جسے سماج یا سوسائٹی یا قوم کہا جاتا ہے؟ یا پوری نوعِ انسانی؟ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی تقدیر آپ بناتا ہے تو ذرا اُن چیزوں پر ایک نگاہ ڈال لیجیے جن سے تقدیر بنتی ہے، پھر فرمائیے کہ آدمی اُن میں سے کس کس پر قابو رکھتا ہے۔ تقدیر بنانے کا پہلا سامان آدمی کے اعضاء اور اس کی ذہنی اور جسمانی قوتیں اور اس کے اخلاقی اوصاف ہیں جن کی درستی اور خرابی، توازن اور عدمِ توازن، کمی اور بیشی کا فیصلہ کُن اثر اس کی تقدیر پر پڑتا ہے۔ مگر یہ ساری چیزیں ہر انسان ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے اور آج تک کوئی ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہیں ہوا ہے جو خود اپنی تجویز اور اپنے انتخاب کے مطابق اپنے آپ کو بنا کر لایا ہو۔ پھر آدمی کی تقدیر کے بننے اور بگڑنے میں اُن بہت سے اثرات کا دخل بھی ہوتا ہے جو ہر انسان کو وراثت میں اپنے آباو اجداد سے ملتے ہیں۔ پھر جس خاندان، جس سوسائٹی، جس طبقے، جس قوم اور جس ملک میں وہ پیدا ہوتا ہے اس کی ذہنی، اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی حالت کے بے شمار اثرات دنیا میں قدم رکھتے ہی اُس پر چھا جاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں

آدمی کی تقدیر بنانے میں حصہ لیتی ہیں، مگر کیا کوئی شخص ایسا ہے جس نے اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے اُس نسل اور اُس ماحول کا تعین کیا ہو جس میں اُسے پیدا ہونا ہے اور خود یہ فیصلہ کیا ہو کہ وہ ان میں سے کس کس کے کیا اثرات قبول کرے؟ اسی طرح آدمی کی تقدیر پر دنیا کے بہت سے واقعات اور اتفاقات کے بھی اچھے اور بُرے اثرات پڑتے ہیں۔ زلزلے، سیلاب، قحط، موسم، بیماریاں، لڑائیاں، معاشی اتار چڑھاؤ اور اتفاقی حادثے اکثر انسان کی پوری زندگی کا رُخ بدل دیتے ہیں اور اس کے ان سارے نقشوں کو درہم برہم کر ڈالتے ہیں جو اس نے بڑے سوچ بچار اور بڑی کوششوں سے اپنی راحت اور اپنی کامیابی کے لیے بنائے ہوتے ہیں۔ اور اس کے برعکس بارہا یہی اتفاقات اچانک ایک انسان کو ایسی کامیابیوں تک پہنچا دیتے ہیں جن کے حصول میں فی الواقع اس کی اپنی کوشش کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ یہ ایسی نمایاں حقیقتیں ہیں جن سے انکار کرنے کے لیے بڑی ہٹ دھرمی کی ضرورت ہے۔ پھر آخر یہ کیسے مان لیا جائے کہ آدمی اپنی تقدیر آپ بناتا ہے؟

اب اگر آپ اپنے دعوے میں ترمیم کر کے یہ کہتے ہیں کہ افراد نہیں بلکہ قومیں اپنی تقدیر بناتی ہیں تو یہ بھی ماننے کے قابل بات نہیں۔ ہر قوم کی تقدیر جن اسباب سے بنتی ہے اُن میں نسلی خصوصیات، تاریخی اثرات، جغرافی حالات، قدرتی وسائل اور بین الاقوامی صورتِ حال کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور یہ بات دنیا کی کسی قوم کے بس میں نہیں ہے کہ وہ ان اسباب کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنی تقدیر جیسی چاہے خود بنا لے۔ پھر وہ قانونِ قدرت جس کے تحت زمین و آسمان کا انتظام ہو رہا ہے اور جس میں دخل دینا تو درکنار اُسے پوری طرح جان لینا بھی کسی قوم کے بس کا کام نہیں ہے، اِس طرح قوموں کی تقدیر پر اثر ڈالتا ہے کہ اس کو روکنے یا اس سے بچنے کی طاقت کسی قوم کو حاصل نہیں۔ یہ قانون پسِ پردہ اپنا کام کرتا رہتا ہے اور کبھی اچانک اور کبھی بتدریج اس کے عمل سے ایسے نتائج رونما ہوتے ہیں جو اُبھرتی ہوئی قوموں کو گراتے اور گرتی ہوئی قوموں کو اُبھا دیتے ہیں۔ خیر یہ تو وہ اسباب ہیں جو صریح طور پر انسانی دست رس سے باہر ہیں۔ مگر جو اسباب بظاہر انسان کی دست رس میں ہیں اُن کا تفصیلی جائزہ بھی کچھ بہت امید افزا نہیں ہے۔ ایک قوم کی تقدیر بننے کا بہت کچھ انحصار

اس پر ہے کہ اسے مناسب رہنمائی (لیڈرشپ) میسر آئے اور اس کے افراد کی ایک اچھی خاصی تعداد میں وہ صفات اور وہ خصوصیات موجود ہوں جو اس رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہیں۔ مگر تاریخ سے ہم کو ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی، اور نہ اپنے زمانہ کے مشاہدات میں ہم ایسی کوئی نظیر پاتے ہیں کہ کسی قوم نے ان دونوں چیزوں کے حاصل کرنے میں آزادی کے ساتھ خود اپنے ارادے اور انتخاب سے کام لیا ہو۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جب ایک قوم کے اُبھرنے کا وقت آتا ہے تو اس کو اچھی رہنمائی بھی میسر آجاتی ہے اور اس میں وہ خصوصیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو اس رہنمائی کی کامیابی کے لیے مطلوب ہیں، اور وہی قوم جب گرنے لگتی ہے تو رہنمائی اور پیروی دونوں کی قابلیتیں اس سے اس طرح رخصت ہو جاتی ہیں کہ اس کا کوئی دردمند بھی خواہ انھیں واپس نہیں لا سکتا۔ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ وہ کونسا قانون ہے جس کے تحت تاریخ اقوام کے یہ نشیب و فراز واقع ہوتے ہیں۔

پھر کیا قوموں کو چھوڑ کر آپ پوری نوع انسانی کے متعلق یہ حکم لگائیں گے کہ وہ اپنی تقدیر آپ بناتی ہے؟ مگر یہ کہنا اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ نسلوں اور قوموں میں بٹی ہوئی، ملکوں میں پھیلی ہوئی، بے شمار مختلف تمدنوں اور تہذیبوں میں رنگی ہوئی، اور لاتعداد زبانیں بولنے والی نوع کے متعلق اگر کوئی شخص یہ فرض کرتا ہے کہ اس کا کوئی ایک مجموعی ارادہ ہے جس کے مطابق وہ سوچ سمجھ کر اپنی تقدیر معین کرتی ہے، تو حقیقت میں وہ ایک بڑی عجیب بات فرض کرتا ہے۔ کیا واقعی اس نوع نے اپنی رفتارِ ترقی کے لیے یہ ٹائم ٹیبل خود تجویز کیا تھا کہ فلاں دور تک یہ پتھر کے اوزاروں سے کام لے گی، پھر لوہے اور آگ کو استعمال کرنا شروع کر دے گی؟ فلاں عہد تک انسانی اور حیوانی طاقت سے کام کرتی رہے گی، پھر مشین کی طاقت استعمال کرنے لگے گی؟ فلاں صدی تک کمپاس کے بغیر کشتیاں چلائے گی پھر اپنی سمت سفر معین کرنے میں کمپاس سے کام لے گی؟ پھر کیا وہ نوع انسانی ہی ہے جس نے افریقہ، امریکہ، یورپ، ایشیا، اور آسٹریلیا کی مختلف قوموں یعنی خود اپنے مختلف حصوں کے لیے مختلف تقدیریں معین کی ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسے عجیب و غریب دعوے

کرنے کا خیال بھی کوئی ہوشمند آدمی نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد آپ کے لیے اپنی اس رائے پر قائم رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ انسان اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔ کیونکہ جب نہ ہر ہر فرد اپنی تقدیر کا مالک ہے، نہ افراد کا کوئی مجموعہ، نہ پوری نوع، تو یہ تقدیر کی ملکیت آخر کس "انسان" کے حصہ میں آئے گی؟

آپ نے دیکھا، وہ سوالات جو میں نے ابتدا میں آپ کے سامنے پیش کیے تھے، ان کا جواب نہ محض "ہاں" کی صورت میں دیا جا سکتا ہے اور نہ محض "نہیں" کی صورت میں۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے۔ جو زبردست ارادہ کائنات کے اس زبردست نظام کو چلا رہا ہے اس سے آزاد ہو کر کوئی چیز دنیا میں کام نہیں کر سکتی، بلکہ کام کرنا تو کیا معنی جی بھی نہیں سکتی۔ ایک ہمہ گیر اسکیم ہے جو پوری قوت کے ساتھ زمین و آسمان میں چل رہی ہے۔ کسی میں اتنا بل بوتہ نہیں ہے کہ اس اسکیم کے خلاف چل سکے یا اس کو بدل سکے یا اس پر کوئی اثر ڈال سکے۔ ہمارے جتنے علوم، جتنے تجربات، جتنے مشاہدات ہیں سب کے سب اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ کائنات کی اس سلطنت میں کسی کی خود مختاری کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آسمان کے بڑے بڑے کُرّوں کو جس نظام کی بندش اپنے مقرر کردہ راستے سے بال برابر جنبش نہیں کرنے دیتی، زمین کو جس طاقت نے ایک ضابطہ کے مطابق گردش کرنے پر مجبور کر رکھا ہے، ہوا اور پانی اور روشنی اور گرمی و سردی پر جس حکومت کا مکمل اقتدار ہے، انسان کی پیدائش سے پہلے جس قوت نے وہ اسباب فراہم کیے جن سے اس زمین پر انسان کا موجود ہونا ممکن ہوا اور جس قوت کے اختیارات کا یہ حال ہے کہ اسباب زندگی کے توازن میں تھوڑا سا ردّ و بدل بھی کر دے تو ہماری پوری نوع آن کی آن میں فنا کے گھاٹ اتر سکتی ہے، اس کے ماتحت رہتے ہوئے انسان کے لیے ایسی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اپنی تقدیر جیسی چاہے خود بنا لے۔ مگر یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ طاقت جو ہمیں اس دنیا میں لائی ہے جس نے ہم کو علم، غور و فکر، ارادہ اور فیصلے کی قوتیں دی ہیں، جس نے ہم میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ ہم کچھ اختیار رکھتے ہیں، جس نے ہم میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ ہم نیک و بد میں امتیاز

کرتے ہیں، اخلاقی اور غیر اخلاقی افعال میں فرق کرتے ہیں اور دنیا کے معاملات میں ایک طرزِ عمل اختیار کرتے اور دوسرا طرزِ عمل ترک کرتے ہیں، اس نے یہ سب کچھ ہمارے ساتھ محض مذاق کے طور پر کیا ہے۔ ہمیں اس کائنات کی تدبیر و انتظام میں انتہا درجہ کی سنجیدگی نظر آتی ہے۔ مذاق اور کھیل اور تمسخر کہیں نظر نہیں آتا۔ لہٰذا حقیقت وہی ہے جو وجدانی طور پر ہم میں سے ہر شخص محسوس کرتا ہے، یعنی فی الواقع ہم کو یہاں ایک محدود پیمانہ پر کچھ اختیارات دیے گئے ہیں اور ان اختیارات کے استعمال میں ہم مناسب حد تک آزاد بھی رکھے گئے ہیں۔ یہ آزادی حاصل کی ہوئی نہیں ہے بلکہ دی ہوئی ہے۔ اس کی مقدار کتنی ہے، اس کے حدود کیا ہیں اور اس کی نوعیت کیا ہے، اس کا تعین مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ آزادی ہے ضرور۔ کائنات کی عالمگیر اسکیم میں ہمارے لیے یہی جگہ تجویز کی گئی ہے کہ ہم ایک محدود پیمانہ پر آزادانہ کام کرنے والے ایکٹر کا پارٹ ادا کریں۔ ہمارے لیے یہاں اتنی ہی آزادی ہے جتنی آزادی کی اس اسکیم میں گنجائش ہے۔ اور ہم اخلاقی حیثیت سے درحقیقت اسی قدر ذمہ دار ہیں جس قدر ہم کو آزادی بخشی گئی ہے۔ یہ دونوں امور کہ ہم کس قدر آزاد ہیں اور ہم پر اپنے افعال کی ذمہ داری کتنی ہے، ہمارے دائرۂ علم سے باہر ہیں۔ ان کو وہی طاقت جان سکتی ہے جس نے اپنی اسکیم میں ہمارے لیے یہ مقام تجویز کیا ہے۔

یہ نظریہ ہے جو اس مسئلہ میں مذہب نے اختیار کیا ہے۔ مذہب ایک طرف قادرِ مطلق خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اور ہمارے گرد و پیش کی ساری دنیا خدا کی محکوم ہے اور اس کا اقتدار سب پر چھایا ہوا ہے۔ دوسری طرف وہ ہم کو اخلاق کے تصورات دیتا ہے، نیکی اور بدی میں فرق کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اگر ہم ایک راستہ اختیار کریں گے تو ہمیں نجات حاصل ہو گی اور دوسرے راستہ پر چلیں گے تو ہم کو سزا دی جائے گی۔ یہ بات صرف اسی صورت میں معقول ہو سکتی ہے کہ ہم واقعی اپنے اختیار سے اپنی زندگی کا راستہ منتخب کرنے میں آزاد ہوں۔

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

"دین" ایک جامع اصطلاح

(۷) یہاں تک تو قرآن اس لفظ کو قریب قریب انہی مفہومات میں استعمال کرتا ہے جن میں یہ اہل عرب کی بول چال میں مستعمل تھا لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لفظ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس سے مراد ایک ایسا نظامِ زندگی لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرماں برداری قبول کرے، اس کے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرماں برداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانہ کا لفظ "اسٹیٹ" کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے لیکن ابھی اس کو "دین" کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لیے مزید وسعت درکار ہے۔

حسب ذیل آیات میں "دین" اسی اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (توبہ - ۴)

اہل کتاب میں سے جو لوگ نہ اللہ کو مانتے ہیں (یعنی اس کو واحد مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے)، نہ یوم آخر (یعنی یوم الحساب اور یوم الجزاء) کو مانتے ہیں، نہ ان چیزوں کو حرام مانتے ہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے، اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت میں "دین حق" اصطلاحی لفظ ہے جس کے مفہوم کی تشریح واضع اصطلاح جل شانہ نے پہلے تین فقروں میں خود ہی کر دی ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَ

فرعون نے کہا چھوڑو مجھے، میں اس موسیٰ کو قتل ہی کیے دیتا ہوں

وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن - ۳)

اور اب پکارے وہ اپنے رب کو، مجھے خوف ہے کہ وہ کہیں تمھارا دین نہ بدل دے یا زمین میں فساد نہ کھڑا کر دے۔

قرآن میں قصہ فرعون و موسیٰ کی جتنی تفصیلات آئی ہیں ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہاں دین محض "مذہب" کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ "اسٹیٹ" کا ہم معنی ہے۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ اگر موسیٰ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گا، جو نظامِ زندگی اس وقت فراعنہ کی حاکمیت اور رائج الوقت قوانین و رسوم کی بنیادوں پر چل رہا ہے وہ جڑ سے اکھڑ جائے گا اور اس کی جگہ یا تو دوسرا نظام بالکل دوسری ہی بنیادوں پر قائم ہوگا یا نہیں تو سرے سے کوئی نظام قائم ہی نہ ہو سکے گا بلکہ تمام ملک میں بدنظمی پھیل جائے گی۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران - ۲)

اللہ کے نزدیک دین تو دراصل "اسلام" ہی ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران - ۹)

اور جو "اسلام" کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (التوبہ - ۵)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو صحیح رہنمائی اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے اگرچہ شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال - ۵)

اور تم ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کا ہو جائے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (النصر)

جب اللہ کی نصرت آ گئی اور فتح نصیب ہو چکی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اب اپنے رب کی حمد و ثنا اور اس کی تسبیح کرو اور اس سے درگذر کی درخواست

کرو، وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔

ان سب آیات میں دین سے پورا نظامِ زندگی اپنے تمام اعتقادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مراد ہے۔ پہلی دو آیتوں میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صحیح نظامِ زندگی صرف وہ ہے جو خود اللہ ہی کی اطاعت و بندگی (اسلام) پر مبنی ہو۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نظام جس کی بنیاد کسی دوسرے مفروضہ اقتدار کی اطاعت پر ہو، مالکِ کائنات کے ہاں ہرگز مقبول نہیں ہے اور فطرۃً نہیں ہوسکتا اس لیے کہ انسان جس کا مخلوق، مملوک اور پروردہ ہے اور جس کے ملک میں رعیت کی حیثیت سے رہتا ہے وہ تو کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ انسان خود اس کے سوا کسی دوسرے اقتدار کی بندگی و اطاعت میں زندگی گزارنے اور کسی دوسرے کی ہدایات پر چلنے کا حق رکھتا ہے۔ تیسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اسی صحیح و برحق نظامِ زندگی، یعنی اسلام کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کے مشن کی غایت یہ ہے کہ اس نظام کو تمام دوسرے نظاموں پر غالب کرکے رہے۔ چوتھی آیت میں دینِ اسلام کے پیروؤں کو حکم دیا گیا ہے کہ دنیا سے لڑو اور اس وقت تک دم نہ لو جب تک فتنہ، یعنی اُن نظامات کا وجود دنیا سے مِٹ نہ جائے جن کی بنیاد خدا سے بغاوت پر قائم ہے اور پورا نظامِ اطاعت و بندگی اللہ کے لیے خالص نہ ہوجائے۔ پانچویں آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس موقع پر خطاب کیا گیا ہے جب کہ ۲۳ سال کی مسلسل جدوجہد سے عرب میں انقلاب کی تکمیل ہوچکی تھی، اسلام اپنی پوری تفصیلی صورت میں ایک اعتقادی و فکری، اخلاقی و تعلیمی، تمدنی و معاشرتی اور معاشی و سیاسی نظام کی حیثیت سے عملاً قائم ہوگیا تھا اور عرب کے مختلف گوشوں سے وفد پر وفد آکر اس نظام کے دائرے میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس طرح جب وہ کام تکمیل کو پہنچ گیا جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مامور کیا گیا تھا، تو آپ سے ارشاد ہوتا ہے کہ اس کارنامے کو اپنا کارنامہ سمجھ کر کہیں فخر نہ کرنے لگنا، نقص سے پاک، بے عیب ذات اور کامل ذات صرف تمہارے رب ہی کی ہے، لہٰذا اس کارِ عظیم کی انجام دہی پر اس کی تسبیح اور حمد و ثنا کرو اور اس سے درخواست کرو کہ مالک! اس ۲۳ سال کے زمانہ خدمت میں اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں جو خامیاں اور جو کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہوگئی ہوں انھیں معاف فرما دے۔

مطبوعات

آئینۂ مصحف از آقائے نکہت۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ علمیہ بکڈپو، بھنڈی بازار بمبئی۔ قیمت ۸ر

کتاب شعر میں ہے اور زبان فارسی۔ مصنف انجمنِ اسلام بمبئی میں مشرقی زبانوں اور تاریخ اسلام کے استاد ہیں۔ زبان نہایت پاکیزہ اور سلیس ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں "حسنِ جاوید" اور "رموزِ عشق"۔ دونوں حصے تمامتر رباعیات پر مشتمل ہیں۔ "حسنِ جاوید" کا موضوع قرآن ہے۔ اس میں قرآن کی تعریف و توصیف اور حقائقِ قرآنی سے مسلمانوں کی بے اعتنائی پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ دوسرے حصے میں رموزِ عشق کے علاوہ دیگر متفرق مضامین بھی ہیں۔

مِلّتِ ابراہیم از جناب عرشی امرتسری۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ دفتر امتِ مسلمہ، امرتسر، پنجاب۔ قیمت ۵ر۔

امرتسر کی "امتِ مسلمہ" کا مسلک اب معروفِ عام ہو چکا ہے۔ طالبِ حق لوگ ہیں مگر علم اور توازنِ ذہنی کی کمی کے سبب سے افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ عرشی صاحب اسی "امت" کے ایک فرد ہیں اور انھوں نے کتاب میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ملتِ ابراہیم کیا تھی۔ سارے قرآن میں سے "ملتِ ابراہیمؑ" کو تحقیق و اتباعؑ کے لیے چُن لینے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ابراہیمؑ ہی آخری نبی کے مُطاع اور صحفِ ابراہیمؑ ہی قرآن کا ماخذ ہیں (حالانکہ آخری نبیؐ اور ابراہیمؑ میں مطیع اور مطاع کا اور قرآن اور صحفِ ابراہیمؑ میں ماخذ و ماخوذ کا تعلق نہیں۔ بلکہ تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ آخری نبیؐ اور ابراہیمؑ دونوں ایک مطاع کے مطیع ہیں اور قرآن اور صحفِ ابراہیم دونوں ایک ماخذ سے ماخوذ ہیں)۔ دراصل اُن کے اِس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ کی شریعت کے مفصل احکام قرآن میں مذکور نہیں ہیں اس لیے وہ ملتِ ابراہیمؑ کی تحقیق کے سلسلہ میں ایک "مختصر اور قابلِ عمل" دین تلاش کرنا چاہتے ہیں جس میں شریعت کی بندشیں نہ ہوں۔ انھوں نے صلوٰۃِ ابراہیمؑ، زکوٰۃِ ابراہیمؑ، حجِ ابراہیمؑ، روزۂ ابراہیمؑ کی ایک خود ساختہ نوعیت معیّن کی ہے اور انتہائی بے باکی سے لکھا ہے کہ "ابراہیمؑ کی نماز جہت اور قبلہ کی قید سے

آزاد تھی، اُن کی زکوٰۃ فقیہانہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی نہ تھی، ان کا حج بھاگنا دوڑنا اور جگہ جگہ جانور کاٹ پھینکنا نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ’’مقصد یہ ہے کہ بس ’’نماز‘‘ پڑھی جائے بغیر اس کے کہ اس کی صورت معین ہو، روزہ رکھا جائے بغیر اس کے کہ اس کا کوئی ضابطہ ہو، حج کیا جائے بغیر اس کے کہ اس کے کچھ قواعد مقرر ہوں۔ یہ سب تفقہ اور بصیرت کے بغیر قرآن پڑھنے کے نتائج ہیں اور ایسے لوگوں کے حق میں ہماری دعا بس یہ ہے کہ اللہ نے جب اُن کو اپنی کتاب پڑھنے کی توفیق بخشی ہے تو اس کے ساتھ انھیں کتاب کی سمجھ بھی عطا فرمائے۔

معلمِ قرآن از منظہر احمد صاحب دہی تھانوی ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ ہدیہ ۸ر علاوہ محصول ڈاک۔

یہ قرآن کے تیسویں پارے کا ترجمہ ہے ہر سورت کو لے کر شروع میں شانِ نزول لکھی ہے، اس کے بعد سورۃ کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف کے ترتیب وار الگ الگ معانی لکھے ہیں، اس کے بعد سورۃ کو عنوانات میں تقسیم کر کے ہر عنوان کے نیچے سورۃ کا ایک ٹکڑا مع ترجمہ لکھا ہے۔ جا بجا مختصر تفسیری نوٹ بھی ہیں۔ عربی سے ناواقف یا مبتدی کے لیے جو سورت کو سمجھنا چاہے یہ ترجمہ مفید ہوگا۔

فلاحِ دین و دُنیا تالیف ماسٹر شیخ محمد عظیم ایلچپوری ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ شیخ رحیم ولد شیخ محمود جنرل بکڈپو، ایلچپور، برار۔

مولف کا مقصد مسلمان قوم کی دینی و دنیوی اصلاح ہے۔ کتاب کے دو باب ہیں۔ پہلے باب میں مسلمان مردوں اور عورتوں کو اسلام کے احکام کا پابند ہونے اور اسوۂ رسول پر چلنے کو لکھا گیا ہے۔ دوسرے باب میں مسلمانوں کی تنظیم کے لیے عملی تجویزیں پیش کی ہیں۔ اس سلسلہ میں معاشی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو اسلام کے اقتصادی نظام کو قائم کرنے کی ترغیب دی ہے صنعت و تجارت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اصلاح رسوم پر زور دیا ہے۔

گلدستہ نماز از فضل الرحمٰن صاحب کلیم۔ ملنے کا پتہ شیخ فضل الرحمٰن کلیم، حافظ آباد، ضلع گوجرانوالہ۔

اس میں نماز کے ارکان میں سے ایک ایک کو لے کر پہلے اس کے الفاظ اور پھر پوری عبارت کے لفظی اور

بامحاورہ معنی لکھے گئے ہیں۔ ساتھ ساتھ مطالب کی بھی تشریح کر دی گئی ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے۔ اگر بچوں کو نماز باترجمہ پڑھانے کی ضرورت ہو تو گلدستۂ نماز اس ضرورت کو پورا کرے گا۔

حقیقت الصوم از مولانا تمنا عمادی۔ قیمت ا؎ ملنے کا پتہ منیجر مکتبہ اسلامیہ دارالادب پھلواری شریف (پٹنہ)

اس میں مولف نے بتایا ہے کہ روزے کی حقیقت اور اس کا مقصد کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ جس روزے سے متوقع مقصد حاصل نہ ہو وہ روزہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔

محمدؐ رسول اللہ مترجمہ مولانا عبدالرحمن صاحب عاقل رحمانی۔ کتابستان، پوسٹ بکس نمبر ۶۴ ۱۳۱، بمبئی نمبر ۳ قیمت ۸ / ۔

یہ انگلستان کے مشہور مفکر طامس کارلائل کے مجموعہ خطبات "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں سے ایک خطبے کا ترجمہ ہے۔ انبیاء کی فہرست میں سے کارلائل نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہیرو منتخب کیا ہے اور انھی کو اپنے ایک مستقل خطبے کا موضوع بنایا ہے۔ کارلائل ایک صاف دل اور بے تعصب انسان تھا۔ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے مطالعہ سے جو تاثرات اس کے دل و دماغ نے اخذ کیے ہیں ان کا اظہار بلاکم و کاست اُس نے اپنے خطبے میں کر دیا ہے۔ اُس کی سنجیدہ اور متین زبان اور اس کا پُر زور اور بلیغ اندازِ بیان اِس موضوع کے لیے خوب موزوں تھا لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ترجمہ میں اصل کی خصوصیات کسی طرح برقرار نہیں رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کارلائل کے تشبیہات و استعارات سے بھرے ہوئے مضامین کو اردو کا قالب پہنانا بہت مشکل ہے تاہم موجودہ ترجمے سے بہتر ترجمہ ممکن تھا۔ اس میں تو اکثر جگہ مطلب ہی خبط ہو گیا ہے اور اکثر جملے لفظی ترجمہ ہونے کی وجہ سے بھونڈے ہو کر رہ گئے ہیں مثلاً "گناہ جو جزئیات اور پوست ہوں بالکل آسان اور معمولی چیزیں ہیں"۔ "وہ مردہ خشک ریت کی طرح بالکل صاف ہے"۔ "کعبہ دنیا کی عجیب شانوں والوں میں سے ایک عجیب شان والی چیز ہے"۔ ایک ایک صفحہ غیر مانوس ترکیبوں اور الفاظ سے بھرا پڑا ہے۔ مثلاً فاش وحشت، ابدیت مجہولہ، ملامت ذاکرہ، تاقب نظر،

بر تربیت، صنعتِ تحریر، انتشارِ حق حتیٰ کہ زبان کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ مثلاً صاف و شفاف رات کا سحر، جھوٹے اصطلاحات، دہشت اور شک کے ساتھ توجہ کیا۔

آخر میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ مغربی مصنفین کا اللہ، نبی، وحی، اور کتاب کا تصور ہمارے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ اس لیے ایک مسلمان مترجم کے لیے ضروری ہے کہ اسلام سے متعلق ان کی ہر تصنیف کا ترجمہ کرتے وقت اِس بنیادی اختلاف کو واضح کر دے تاکہ پڑھنے والا ان کی غلطیوں پر متنبہ ہو جائے۔

شانِ خدا تالیف مولانا عبدالرحمٰن صاحب عاقل رحمانی۔ ضخامت ۴۸ صفحات، کتابستان، قیمت ایک روپیہ۔

کتاب کا موضوع وجودِ باری ہے۔ تالیف میں کسی منطقی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے چند یونانی اور یورپین فلاسفہ کے اقوال اثباتِ وجودِ خالق کے بارے میں درج کیے ہیں۔ اس کے بعد چند ملحدین کے شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ پھر ایک باب مادہ اور روح سے متعلق ہے۔ اس کے بعد "قرآن اور وجودِ خالق" کے عنوان کے تحت بتایا ہے کہ وجودِ خالق کے ثبوت میں قرآن کا طرزِ استدلال کیا ہے۔ یہ ساری بحث کا اہم ترین پہلو تھا، اسے پوری طرح واضح اور مکمل ہونا چاہیے تھا اور قرآنی طرزِ استدلال کی نوعیت اور حکمار و فلاسفہ کے طرزِ استدلال سے اِس کے بنیادی فرق کو پوری طرح واضح کر دینا چاہیے تھا۔ اِس کے بعد ایک باب تصورِ توحید سے متعلق ہے۔ اِس میں دیگر مذاہب سے مقابلہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ توحید اسلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ ساتھ ہی توحید کے لیے چند دلائل پیش کیے ہیں۔ سب سے آخری باب اسمار و صفات سے متعلق ہے۔ اِس میں اللہ کے ننانوے (۹۹) ناموں کو مختلف عنوانات کے ماتحت جمع کیا ہے اور بتایا ہے کہ قرآن میں اُن کے ذکر کا مقصد کیا ہے۔